ربیع الثّانی ۱۴۴۲ھ
دسمبر ۲۰۲۰ء

ماہنامہ میثاق لاہور

یکے از مطبوعات

تنظیمِ اسلامی

بانی: ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نبی اکرم ﷺ بحیثیت منتظم

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ

داعی رجوع الی القرآن، بانی تنظیم اسلامی

محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

کے شہرۂ آفاق دورۂ ترجمہ قرآن پر مشتمل

بیانُ القرآن

ترجمہ و مختصر تفسیر

حصہ اول: سورۃ الفاتحہ و سورۃ البقرۃ مع تعارفِ قرآن
صفحات: 360، قیمت 500 روپے

حصہ دوم: سورۃ آل عمران تا سورۃ المائدہ
صفحات 326، قیمت 500 روپے

حصہ سوم: سورۃ الانعام تا سورۃ التوبہ
صفحات 331، قیمت 500 روپے

حصہ چہارم: سورۃ یونس تا سورۃ الکہف
صفحات 394، قیمت 550 روپے

حصہ پنجم: سورۃ مریم تا سورۃ السجدۃ
صفحات 480، قیمت 750 روپے

حصہ ششم: سورۃ الاحزاب تا سورۃ الحجرات
صفحات 484، قیمت 750 روپے

حصہ ہفتم: سورۃ قٓ تا سورۃ النّاس
صفحات 560، قیمت 800 روپے

(مکمل سیٹ: 4300 روپے)

مکتبہ خدام القرآن لاہور

36-K، ماڈل ٹاؤن لاہور، فون 3-35869501(042)

وَاذْكُرُوْا نِعْمَةَ اللّٰهِ عَلَيْكُمْ وَمِيْثَاقَهُ الَّذِيْ وَاثَقَكُمْ بِهٖٓ ۙ اِذْ قُلْتُمْ سَمِعْنَا وَاَطَعْنَا ۡ (المائدۃ:۷)

ترجمہ: اور اپنے اوپر اللہ کے فضل اور اس کے میثاق کو یاد رکھو جو اس نے تم سے لیا جبکہ تم نے اقرار کیا کہ ہم نے مانا اور اطاعت کی!

ماہنامہ میثاق لاہور

اجرائے ثانی
ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

جلد	:	69
شمارہ	:	12
ربیع الثّانی		1442ھ
دسمبر		2020ء
فی شمارہ	:	40 روپے

مُدیر
حافظ عاکف سعید

نائب مُدیر
حافظ خالد محمود خضر

سالانہ زرِتعاون
- اندرون ملک 400 روپے
- بھارت و بنگلہ دیش 900 روپے
- ایشیا، یورپ، افریقہ وغیرہ 1200 روپے
- امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا وغیرہ 1500 روپے

ترسیلِ زر: مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

مکتبہ خدام القرآن لاہور

مقامِ اشاعت: 36۔ کے ماڈل ٹاؤن، لاہور 54700، فون: 3-35869501
فیکس: 35834000، ای میل: maktaba@tanzeem.org
رابطہ برائے ادارتی امور: (042)38939321
publications@tanzeem.org
ویب سائٹ: www.tanzeem.org

مرکزی دفتر تنظیم اسلامی: ''دارُالاسلام'' ملتان روڈ چوہنگ لاہور
(پوسٹل کوڈ 53800) فون: (042)35473375-78

پبلشر: ناظم مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
طابع: رشید احمد چوہدری مطبع: مکتبہ جدید پریس (پرائیویٹ) لمیٹڈ

مشمولات

عرضِ احوال — 5

''جب تم حیا کا پردہ اُٹھا دو تو پھر جو چاہے کرو!'' — ایوب بیگ مرزا

بیانُ القُرآن — 9

سورۃ الحجرات (آیات ۱ تا ۱۸) — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

نقوشِ سیرت — 32

نبی اکرم ﷺ بحیثیت منتظم — ڈاکٹر اسرار احمدؒ

سُنّت و سیرت — 40

دامنِ مصطفیٰ ﷺ سے وابستگی: تمام مسائل کا واحد حل — ڈاکٹر محمد جہان یعقوب

کتابِ زندہ — 47

قرآن کا معجزہ — اُمّ احسن

اسلامی طرزِ حیات — 59

عصری تہذیبی مسائل اور حل — شکیلہ عبد الحمید

اُسوۂ حسنہ — 71

ختمِ نبوت کا ایک تکمیلی پہلو:
ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کا کردار — انجینئر مختار حسین فاروقی

انوارِ ہدایت — 88

حضرت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ — پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

’’جب تم حیا کا پردہ اُٹھا دو تو پھر جو چاہے کرو!‘‘

قوموں کے عروج و زوال کی داستانوں سے تاریخ اَٹی پڑی ہے۔ اُمّتِ مُسلمہ کا معاملہ یہ ہے کہ کبھی اِس کا مکمل اور ہمہ گیر عروج تھا اور اِسلامی ریاست کئی براعظموں تک پھیلی ہوئی تھی۔ پھر عروج و زوال جغرافیائی لحاظ سے تقسیم ہو گیا یعنی ہسپانیہ میں مسلمانوں کو بدترین شکست ہوئی‘ یہاں تک کہ وہاں مسلمانوں کا نام و نشان مٹا دیا گیا۔ وہی وقت تھا جب پورا ہندوستان مغلوں کے زیرِ تسلط پہلی مرتبہ متّحد ہوا۔ برصغیر پر دو صدیوں تک مسلمانوں نے اقلیت میں رہتے ہوئے یوں حکومت کی کہ کوئی مقابل دور دور نظر نہیں آتا تھا۔ مغلوں کا ہندوستان میں زوال شروع ہوا تو خلافتِ عثمانیہ پورے جاہ و جلال سے دنیا کے ایک بڑے حصّہ پر چھائی ہوئی تھی۔ یوں مسلمانوں کا معاملہ ’’اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے‘‘ کا چل رہا تھا۔ خلافتِ عثمانیہ کا خاتمہ اگرچہ اعلانیہ طور پر ۱۹۲۴ء میں ہوا‘ لیکن ایک مدت ہوئی تھی کہ اُس کے پاؤں اُکھڑ چکے تھے۔ مغرب سے اُٹھنے والے طوفان کے سامنے وہ بڑی بے بس نظر آ رہی تھی۔ یوں سمجھئے کہ اب دو اڑھائی صدیوں سے پوری اُمّتِ مُسلمہ سیاسی لحاظ سے بلندیوں سے پستیوں کی طرف بڑی تیزی سے لڑھک رہی ہے اور کہیں پاؤں جما نہیں پا رہی۔ یہ پستی کا سفر‘ یہ زوال اب ہمہ گیر اور ہمہ جہت ہے۔ مولانا حالی نے جب یہ نوحہ پڑھا تھا:

پستی کا کوئی حد سے گزرنا دیکھے — اسلام کا گر کر نہ اُبھرنا دیکھے
مانے نہ کبھی کہ مد ہے ہر جزر کے بعد — دریا کا ہمارے جو اُترنا دیکھے!

اُس وقت ہم جس مقام پر تھے‘ آج اُس مقام کو بھی ہمیں سر اُٹھا کر دیکھنا پڑتا ہے۔ اِس لیے کہ گزشتہ پچاس ساٹھ سال پر نظر دوڑائیں‘ مسلمانوں کے ساتھ کیا کچھ ہوا؟ سقوطِ ڈھاکہ کا سانحہ پیش آیا اور پاکستان دولخت ہوا۔ بیت المقدس اُمّتِ مُسلمہ کے ہاتھ سے نکل کر اُس کے بدترین دشمن کے قبضہ میں چلا گیا۔ شام کی دفاعی لحاظ سے اہم گولان کی پہاڑیاں اسرائیل کے قبضہ میں جا چکی ہیں۔ ۱۹۷۴ء میں اسرائیل پر حملہ آور ہونے والا انور سادات کیمپ ڈیوڈ میں یہودیوں

کے سامنے ڈھیر ہو گیا اور اُس نے اُن کی بالادستی قبول کر لی۔ فلسطینیوں کو گھروں سے دربدر کیا گیا اور وہاں یہودی بستیاں آباد ہو رہی ہیں۔ عرب جو کبھی فلسطینیوں کے محافظ سمجھے جاتے تھے‘ آج اُن پر ظلم کرنے میں اسرائیل کا ہاتھ بٹا رہے ہیں۔ گویا عسکری لحاظ سے اسرائیل کے سامنے حالتِ رکوع میں اور سیاسی لحاظ سے حالتِ سجدہ میں ہیں۔ باقی مسلمان ممالک کی حالت بھی کوئی اچھی نہیں۔ صرف ترکی حالتِ قیام میں آنے کی کوشش میں ہے۔ بہرحال یہ سیاسی اور عسکری زوال ہے جو اگرچہ تشویشناک اور افسوسناک ہے لیکن تاریخ کے آئینے میں ہم بہت اُتھل پتھل دیکھتے ہیں۔ کیسے غالب قوتیں مغلوب ہوئیں اور مغلوب قوتوں کو غلبہ ملا۔ یہ اگر گزرے ہوئے کل میں ممکن تھا تو آنے والے کل میں بھی ممکن ہوگا۔

ہمارا اصل مسئلہ یہ ہے کہ تہذیبی اور معاشرتی سطح پر ابھی ہم کچھ resist کر رہے تھے۔ مذہب کی بنیاد پر ہم اپنے کلچر‘ اپنی روایات‘ اپنی بود و باش‘ اپنے لباس کا دفاع کرتے نظر آتے تھے۔ سعودی عرب میں سینما نہ تھے۔ وہاں خواتین پر گاڑی چلانے کی پابندی تھی۔ عرب اپنی زبان اور اپنے لباس پر اصرار کرتے نظر آتے تھے۔ اُس زمانے کے برصغیر پر نظر ڈالیں‘ سیاسی اور عسکری شکست نے معاشرت اور تہذیب پر نظر نہ آنے والا اثر ڈالا تھا۔

اُنیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے آغاز تک انگریزوں کے سیاسی تسلّط اور غلبہ کے باوجود ہندوستان میں مسلمان معاشرتی اور تہذیبی لحاظ سے الگ تھلگ نظر آتے تھے۔ سرسیّد جیسا انسان بھی جو ظاہری و باہری اور ذہنی و قلبی طور پر اگرچہ انگریزوں کے غلبے کو تسلیم کر چکا تھا اور جدید تعلیم حاصل کرنے اور انگریزی زبان سیکھنے کی مسلمانوں میں تبلیغ کر رہا تھا‘ لیکن وہ بھی باریش تھا‘ مشرقی لباس پہنتا تھا اور عورت کے پردے کا شدّت سے قائل تھا۔ ہم کہنا یہ چاہتے ہیں کہ سیاسی اور عسکری لحاظ سے بدترین حالتِ مغلوبیت میں بھی مسلمانوں میں شاذ کے درجہ میں کچھ افراد یا کچھ گھرانے ہوں گے جنہوں نے مغربی تہذیب کو کھلم کھلا اپنایا تھا۔ لیکن پہلی جنگِ عظیم کے بعد یا یوں کہہ لیجیے کہ خلافتِ عثمانیہ کے اعلانیہ خاتمے کے بعد اور نیشن سٹیٹس (Nation States) قائم ہونے کے ساتھ ہی مسلمانوں میں اقتدار کی بندر بانٹ ہوئی اور انہیں مبینہ طور پر سیاسی آزادیاں مل گئیں تو مغربی تہذیب اور مغربی معاشرت کی ہمارے ہاں قبولیت نظر آنے لگی جو بڑھتی چلی جا رہی ہے۔ اِس سے پہلے ۱۲ یا ۱۳ صدیوں میں مسلمان خواہ فاتح اور غالب رہے یا مفتوح اور مغلوب‘ اُنہوں نے کبھی غیر کی تہذیب اور معاشرت کو قبول نہ کیا تھا۔ لیکن آج

مسلمانوں کا کوئی ملک بھی نظر نہیں آتا جو بحیثیت مجموعی مغربی تہذیب میں رنگا نہ جا چکا ہے۔

پاکستان سمیت مسلمان ممالک کی ایلیٹ‘ اِلّا ماشاء اللہ‘ مغرب کی اِس بے ہودہ تہذیب کی لپیٹ میں آ چکی ہے۔ دوسرے اسلامی ممالک کی طرح پاکستان میں بھی ایک عرصہ سے ہر طرح کے غیر اسلامی شعائر کو اپنایا جا چکا ہے‘ لیکن ’’عائلی قوانین‘‘ کے سوا غیر اسلامی مظاہر کو قانونی شکل ہرگز نہیں دی گئی۔ لیکن افسوس صد افسوس کہ جس سرزمین پر اسلام نے جنم لیا تھا یعنی جزیرہ نمائے عرب اور اُس کے نواحی خلیجی ممالک میں گزشتہ چند سالوں میں اسلامی معاشرت کا کیا حشر ہوا ہے اور اُسے کس طرح تباہ و برباد کیا گیا ہے‘ اُس کے احوال تحریر کرتے ہوئے قلم کانپ رہا ہے اور یہ سب کچھ سرکاری سرپرستی میں ہو رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ اِس قوم پر رحم فرمائے!

محافظین حرمین شریفین لیڈ کر رہے ہیں سینما‘ نائٹ کلب‘ جوا خانے کھل رہے ہیں اور اب متحدہ عرب امارات نے تو اُمّ الخبائث یعنی شراب پینے کی کھلی اجازت دے دی ہے اور غیر منکوحہ جوڑوں کو بلا روک ٹوک اکٹھا رہنے کی قانونی طور پر اجازت مل گئی ہے‘ یعنی مغرب کے اُس living together کے فلسفے کو سرکاری اور قانونی طور پر اپنا لیا گیا ہے۔ ہمارے نزدیک متحدہ عرب امارات نے اسلامی معاشرت پر ایٹم بم گرا دیا ہے‘ اسلام کے خلاف کھلی بغاوت کا اعلان کر دیا ہے۔ شراب نوشی اور زنا کاری کی اجازت تو اصل عیسائیت اور یہودیت بھی نہیں دیتی۔ ہم سمجھتے ہیں کہ اِن عربوں نے اللہ تعالیٰ کے غضب کو دعوت دی ہے۔ کیا ہمیں عربوں کو سمجھانے کی ضرورت ہے کہ ہمارا غفور و رحیم رب خطا کاروں کو تو رجوع کرنے پر معاف کر دیتا ہے‘ لیکن گناہ پر اصرار کرنے والے باغیوں کے لیے وہ جبار اور قہار بھی ہے اور منتقم بھی۔ وہ توبہ نہ کرنے والے نافرمانوں کو دنیا میں بھی ذلیل و خوار کرتا ہے اور آخرت میں اُن کا انجام آگ کے سوا کچھ نہیں ہوتا۔

کیا ہم عربوں کو بتائیں گے کہ فرمانِ نبوی ﷺ ہے کہ ’’حیا ایمان کا ایک شعبہ ہے‘‘۔ ’’حیا اور ایمان باہم جڑے ہوتے ہیں‘ حیا نہ رہے تو ایمان بھی نہیں رہتا‘‘۔ آپ ﷺ نے فرمایا: ((اِذَا لَمْ تَسْتَحْیِ فَاصْنَعْ مَاشِئْتَ)) یعنی ’’جب تم حیا کا پردہ اُٹھا دو تو پھر جو چاہے کرو!‘‘ حقیقت یہ ہے کہ سوئے ہوئے کو تو جگایا جا سکتا ہے‘ جاگے کو کون جگائے؟ اے اہلِ عرب! خود پر نگاہ ڈالو اور اپنی موجودہ حالت پر غور کرو۔ اِس سے زیادہ کیا ذلّت و خواری ہو گی کہ آج اسرائیل کے سامنے ہاتھ باندھے کھڑے ہو! امریکہ یہ کہہ کر تمسخر اُڑاتا ہے کہ تمہارا اقتدار اور حکمرانی ہماری رضا اور حکم کے طفیل قائم ہے۔ ذرا غور تو کرو کہ باحیا اور اپنی عزّت و عفت کی محافظ

خواتین نے قرآن میں جگہ پائی۔ اور امیر مصر کی بیوی کس طرح ذلیل و خوار ہوئی اور حضرت یوسف علیہ السلام کس قدر آبرومند اور کامیاب و کامران ہوئے۔

علاوہ ازیں تمام مسلمان حکمرانوں کو ٹیپو سلطان کا یہ قول ازبر ہونا چاہیے اور ہر دم اُن کے سامنے رہنا چاہیے کہ ’’شیر کی ایک دن کی زندگی گیدڑ کی سو سالہ زندگی سے بہتر ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ جسے چاہتا ہے عزّت دیتا ہے اور جسے چاہتا ہے ذلّت دیتا ہے۔ کیا یہ حکمران قرآن میں غور نہیں کرتے کہ فرعون دریا میں غرق ہو جاتا ہے اور موسیٰ علیہ السلام کے لیے پانی راستہ بنا دیتا ہے؟ یاد رکھو! ہر فرعون کا انجام ڈوبنا ہے اور ہر اللہ کے بندے کو بالآخر کامیاب ہونا ہے۔ ذرا غور تو کریں‘ کہاں ہیں تمہارے وہ آباء و اَجداد جو کبھی شان و شوکت سے حکومت کرتے تھے؟ تمہارا اصل مقام بھی وہی ہے‘ صرف وقت کی بات ہے لوٹ آؤ‘ کہ اللہ ربّ العزّت موت سے پہلے لوٹ آنے کی مہلت دیتا ہے۔ ہمارا غفور و رحیم رب انسانوں کے گناہوں کو اپنی رحمت اور کرم سے ڈھانپ دیتا ہے۔

گزشتہ شمارے میں رضی الدین سیّد صاحب کا مضمون ’’مسلم صہیونیت‘‘ شائع ہوا تھا‘ جس میں ایڈیٹنگ کے دوران یہ جملے شامل کیے گئے تھے: ’’دوسری طرف آلِ سعود کو جزیرہ نمائے عرب میں ایسا پابند اقتدار دیا کہ وہ مغرب کے جال سے کبھی نہ نکل سکے۔ حقیقت یہ ہے کہ آلِ سعود نے اپنے آقاؤں کو جس طرح خوش رکھا اور ان کے فرماں بردار رہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔ البتہ عرب عوام اس کا خمیازہ بُری طرح بھگت رہے ہیں‘‘۔ واضح رہے کہ یہ جملے صاحبِ مضمون کے نہیں ہیں اور انہوں نے اس پر اپنے تحفظات کا اظہار فرمایا ہے —— تاہم ادارہ میثاق اس اضافے کی پوری ذِمّہ داری قبول کرتا ہے۔ اس لیے کہ استعماری قوتوں نے بیسویں صدی کے آغاز سے ہی خلافت کے ادارے کو ختم کرنے کے لیے جو ہتھکنڈے استعمال کیے اُن میں سے ایک یہ بھی تھا کہ جزیرہ نمائے عرب میں ترکوں کے خلاف پہلے نفرت کا طوفان اُٹھایا گیا اور بعد ازاں جو کھلی بغاوت برپا کی گئی اُس میں سعودی قبیلہ کا عبدالعزیز بن عبدالرحمان ہراول دستے کی قیادت کر رہا تھا۔ آلِ سعود استعماری قوتوں کی مدد کے بغیر اقتدار کا تصوّر بھی نہیں کر سکتے تھے۔ یہ اقتدار اُن قوتوں ہی کی مرہونِ منت تھا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ شاہ فیصل شہیدؒ کے سوا تمام حکمرانوں نے کسی نہ کسی انداز میں امریکی ایجنڈے کو آگے بڑھایا اور محمد بن سلمان اسی ایجنڈے کی تکمیل کے لیے بڑی تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ ❁❁❁

دورۂ ترجمۂ قرآن

ڈاکٹر اسرار احمد

سُورۃُ الحُجُرٰت

تمہیدی کلمات

سورۃ الحجرات اٹھارہ آیات اور دو رکوعوں پر مشتمل ایک مختصر سورت ہے۔ جیسا کہ قبل ازیں سورۂ محمد (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) کے تمہیدی کلمات میں بھی بتایا جا چکا ہے کہ سورۂ محمد اور سورۃ الفتح کا آپس میں جوڑے کا تعلق ہے‘ جبکہ سورۃ الحجرات کی حیثیت سورۃ الفتح کے ضمیمے کی سی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ اس میں سورۃ الفتح کی بعض آیات کی وضاحت ملتی ہے۔ مثلاً سورۃ الفتح میں ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ کے الفاظ میں اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی تعظیم و توقیر اور حمایت و نصرت کا حکم دیا گیا ہے جبکہ سورۃ الحجرات میں اس حوالے سے عملی ہدایات دی گئی ہیں۔ اسی طرح سورۃ الفتح میں رُحَمَآءُ بَیۡنَهُمۡ کے الفاظ میں اہلِ ایمان کی شخصیات کی ایک consolidated جھلک دکھائی گئی ہے جبکہ سورۃ الحجرات میں ایک بندۂ مؤمن کے کردار کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔

اس کے علاوہ اس سورت میں غلبۂ دین کی جِدّوجُہد کے حوالے سے جہاد کی اہمیت‘ دین میں جہاد کی اصل حیثیت‘ اسلامی ریاست کی دستوری بنیاد‘ اہلِ ایمان پر اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے حقوق‘ مسلمانوں کے باہمی حقوق اور مسلمان معاشرے کی اجتماعی زندگی کے خدوخال جیسے اہم اور بنیادی مسائل بھی بیان ہوئے ہیں۔

گویا اسلامی ریاست کے اصولوں اور اسلامی معاشرے سے متعلق بنیادی ہدایات کے اعتبار سے سورۃ الحجرات قرآن کی اہم ترین اور جامع ترین سورت ہے۔ اس اعتبار سے یوں سمجھئے کہ اسلامی ریاست اور اسلامی معاشرے سے متعلق جو تفصیلی ہدایات سورۃ النساء اور سورۃ المائدۃ میں دی گئی ہیں ان کا لُبِّ لُباب اور خلاصہ سورۃ الحجرات کی اٹھارہ آیات میں سمو دیا گیا ہے۔

آیات ۱ تا ۵

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَ رَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝۱ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تَرۡفَعُوۡۤا اَصۡوَاتَكُمۡ فَوۡقَ صَوۡتِ النَّبِیِّ وَ لَا تَجۡهَرُوۡا لَهٗ بِالۡقَوۡلِ كَجَهۡرِ بَعۡضِكُمۡ لِبَعۡضٍ اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲ اِنَّ الَّذِیۡنَ یَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِیۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰی ؕ لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّ اَجۡرٌ عَظِیۡمٌ ۝۳ اِنَّ الَّذِیۡنَ یُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا یَعۡقِلُوۡنَ ۝۴ وَ لَوۡ اَنَّهُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰی تَخۡرُجَ اِلَیۡهِمۡ لَكَانَ خَیۡرًا لَّهُمۡ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِیۡمٌ ۝۵

آیت ۱ ﴿یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا لَا تُقَدِّمُوۡا بَیۡنَ یَدَیِ اللّٰهِ وَرَسُوۡلِهٖ وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ سَمِیۡعٌ عَلِیۡمٌ ۝۱﴾ ’’اے اہلِ ایمان مت آگے بڑھو اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم) سے اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو۔ یقیناً اللہ سب کچھ سننے والا‘ سب کچھ جاننے والا ہے۔‘‘

یہ آیت گویا اسلامی ریاست کے آئین کی بنیاد ہے۔ اسلامی ریاست کے آئین کی پہلی شق یہ ہے کہ حاکمیت اللہ ربّ العالمین کی ہے اور اقتدارِ مطلق کا مالک صرف اکیلا وہ ہے۔ اس نظری و اعتقادی حقیقت کی تعمیل و تنفیذ کا طریقہ اس آیت میں بتایا گیا ہے۔ یعنی اللہ اور اس کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے جو حدود قائم کر دی ہیں ان حدود سے کسی بھی معاملے میں تجاوز نہیں ہوگا۔ اس آیت کے مفہوم کو پاکستان کے ہر دستور میں ان الفاظ کے ساتھ شامل رکھا گیا ہے: No Legislation will be done repugnant to the Quran and the Sunnah۔ یہ شق گویا اسلامی ریاست کے آئین کے لیے اصل الاصول کا درجہ رکھتی ہے۔ چنانچہ آئین پاکستان میں اس شق کے شامل ہونے سے اصولی طور پر تو پاکستان ایک

اسلامی ریاست بن گیا‘ لیکن عملی طور پر اس ’’ذِمّہ داری‘‘ سے جان چھڑانے کے لیے کمال یہ دکھایا گیا کہ ان الفاظ کے ساتھ ایک ہاتھ سے آئین کے اندر اسلام داخل کر کے دوسرے ہاتھ سے نکال لیا گیا۔ آئین پاکستان کو قرآن وسُنّت کے مطابق بنانے کے مقصد کے لیے اسلامی نظریاتی کونسل (Islamic Ideological Council) تشکیل دی گئی اور اسے بظاہر یہ اہم اور مقدس فریضہ سونپا گیا کہ وہ پارلیمنٹ کی ’’قانون سازی‘‘ پر گہری نظر رکھے گی اور اس ضمن میں کسی کوتاہی اور غلطی کی صورت میں حکومت کو رپورٹ پیش کرے گی۔ یہاں تک تو معاملہ ٹھیک تھا‘ لیکن اس میں منافقت یہ برتی گئی کہ آئین کی رو سے حکومت کو نظریاتی کونسل کی سفارشات پر عمل کرنے کا پابند نہیں کیا گیا۔ چنانچہ کونسل نے اقتصادیات اور غیر سودی بینکاری کے حوالے سے بہت مفید سفارشات مرتب کی ہیں۔ بہت سے دوسرے معاملات میں بھی تحقیقاتی رپوٹیں حکومتوں کو بھجوائی ہیں۔ کونسل کی سفارشات جمع ہوتے ہوتے الماریاں بھر گئیں‘ لیکن کسی حکومت نے ان میں سے کسی ایک سفارش کو بھی تنفیذ کے حوالے سے لائق اعتناء نہ سمجھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ کونسل کی تمام تحقیقات اور سفارشات کُلّی طور پر لاحاصل مشق (exercise in futility) ثابت ہوئیں۔

بہرحال زیر مطالعہ آیت کی رو سے جب کسی ریاست کے آئین میں مذکورہ شق شامل کر لی جائے گی تو اصولی طور پر وہ ریاست اسلامی ریاست بن جائے گی۔ اس کے بعد اس ریاست کے قانون ساز ادارے کو چاہے پارلیمنٹ کہیں‘ مجلس ملی کہیں یا کانگرس کا نام دیں‘ اس کی قانون سازی کا دائرۂ اختیار (legislative authority) قرآن وسُنّت کی بالادستی کے باعث محدود ہو جائے گا۔ یعنی اس ’’قدغن‘‘ کے بعد وہ مقنّنہ اپنے ملک کے لیے صرف قرآن وسُنّت کے دائرے کے اندر رہ کر ہی قانون سازی کر سکے گی۔ اس دائرے کے اندر جو قانون سازی کی جائے گی وہ جائز اور مباح ہوگی اور اس دائرے کی حدود سے متجاوز ہوتا ہوا کوئی بھی قانون ناجائز اور ممنوع قرار پائے گا‘ چاہے اس قانون کو مقنّنہ کے تمام ارکان ہی کی حمایت حاصل کیوں نہ ہو۔ اسلامی مقنّنہ کی اس ’’محدودیت‘‘ کو اس مثال سے سمجھیں کہ کسی دعوت میں بلائے گئے مہمانوں کی تواضع روح افزا شربت سے کی جائے‘ سیون اَپ سے یا دودھ سوڈا وغیرہ سے‘ اس بارے میں فیصلہ تو کثرتِ رائے سے کیا جا سکتا ہے‘ لیکن تمام میزبان اپنے سو فیصد ووٹوں سے بھی مہمانوں کو کوئی ایسا مشروب پلانے کا فیصلہ نہیں کر سکتے جس کا پینا قرآن وسُنّت میں ممنوع قرار دیا جا چکا

ہے۔ اس نکتے کو رسول اللہ ﷺ نے اس مثال کے ذریعے نہایت عمدگی سے واضح فرمایا ہے۔ آپؐ نے فرمایا: ((مَثَلُ الْمُؤْمِنِ وَمَثَلُ الْإِيْمَانِ كَمَثَلِ الْفَرَسِ فِيْ آخِيَّتِهٖ ، يَجُوْلُ ثُمَّ يَرْجِعُ اِلٰى آخِيَّتِهٖ ...))[1] یعنی ’’مؤمن کی مثال اور ایمان کی مثال اُس گھوڑے کی سی ہے جو اپنے کھونٹے کے ساتھ بندھا ہوا ہے۔ وہ گھومنے پھرنے کے بعد پھر اپنے کھونٹے پر واپس لوٹ آتا ہے.....‘‘ ظاہر ہے مؤمن تو وہی ہے جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ پر ایمان رکھتا ہے اور ان کے احکام کو مانتا ہے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کے احکام کے کھونٹے سے بندھ چکا ہے‘ اب وہ اس کھونٹے کے گرداگرد ایک دائرے میں اپنی مرضی سے چر چُگ سکتا ہے‘ لیکن اس دائرے کی حدود کا تعین اس کھونٹے کی رسّی (حدود اللہ) کے اندر موجود گنجائش کی بنیاد پر ہی ہوگا۔ اس کے برعکس ایک وہ شخص ہے جو مادر پدر آزاد ہے۔ وہ نہ اللہ کو مانتا ہے‘ نہ رسولؐ کو جانتا ہے اور نہ ہی ان کے احکام کو پہچانتا ہے‘ وہ اپنی مرضی کا مالک ہے‘ جو چاہے کرے اور جس چیز کو چاہے اپنے لیے ’’جائز‘‘ قرار دے لے۔ چنانچہ ایسے افراد اگر کسی ملک یا ریاست کے قانون ساز ادارے میں بیٹھے ہوں گے تو وہ کثرتِ رائے سے اپنی ریاست اور قوم کے لیے جو قانون چاہیں منظور کر لیں۔ وہ چاہیں تو ہم جنس پرستی کو جائز قرار دے دیں اور چاہیں تو مرد کی مرد سے شادی کو قانونی حیثیت دے دیں۔

اب اس کے بعد جو چار آیات آ رہی ہیں وہ اہلِ ایمان پر اللہ کے رسول ﷺ کے حقوق کا تعین کرتی ہیں۔ حضور ﷺ کی تعظیم‘ آپؐ کی محبت اور آپؐ کے اتباع کا جذبہ گویا ایک مسلمان معاشرے کی تہذیب اور اس کے تمدن کی بنیاد ہے۔ اس بارے میں ایک عمومی حکم ﴿وَتُعَزِّرُوْهُ وَتُوَقِّرُوْهُ ؕ﴾ ہم سورۃ الفتح میں پڑھ آئے ہیں۔ اس حکم کی شرح گویا اب اگلی آیات میں بیان ہو رہی ہے۔

آیت ۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَرْفَعُوْٓا اَصْوَاتَكُمْ فَوْقَ صَوْتِ النَّبِيِّ وَلَا تَجْهَرُوْا لَهٗ بِالْقَوْلِ كَجَهْرِ بَعْضِكُمْ لِبَعْضٍ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اپنی آواز کبھی بلند نہ کرنا نبی (ﷺ) کی آواز پر اور نہ انہیں اس طرح آواز دے کر پکارنا جس طرح تم آپس میں ایک دوسرے کو بلند آواز سے پکارتے ہو‘‘

۱۔ صحیح ابن حبان‘ ح:۶۱۶۔ الترغیب والترھیب للمنذری: ۱۱۹/۴۔ مجمع الزوائد للھیثمی: ۲۰۴/۱۰۔ مشکاۃ المصابیح‘ کتاب الاطعمۃ‘ باب الضیافۃ۔

﴿اَنۡ تَحۡبَطَ اَعۡمَالُكُمۡ وَاَنۡتُمۡ لَا تَشۡعُرُوۡنَ ۝۲﴾ ’’مبادا تمہارے سارے اعمال ضائع ہو جائیں اور تمہیں خبر بھی نہ ہو۔‘‘

خبردار! نبی کریم ﷺ کی تعظیم و توقیر کا معاملہ بہت نازک اور حساس ہے۔ اس معاملے میں ہمیشہ چوکنا اور ہوشیار رہنے کی ضرورت ہے۔ کہیں ایسا نہ ہو نبی کریم ﷺ کی شان میں کسی معمولی سی بے ادبی سے تم میں سے کسی کے تمام نیک اعمال ضائع ہو جائیں اور وہ اسی زعم میں رہے کہ میں تو پکا سچا مسلمان ہوں‘ ہمیشہ کبائر سے بچ کر رہتا ہوں‘ میں نے کبھی چوری نہیں کی‘ ڈاکا نہیں ڈالا‘ اور کبھی زنا کاری کا نہیں سوچا۔

آیت ۳ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يَغُضُّوۡنَ اَصۡوَاتَهُمۡ عِنۡدَ رَسُوۡلِ اللّٰهِ اُولٰٓئِكَ الَّذِيۡنَ امۡتَحَنَ اللّٰهُ قُلُوۡبَهُمۡ لِلتَّقۡوٰى ؕ﴾ ’’بے شک وہ لوگ جو اپنی آوازوں کو پست رکھتے ہیں اللہ کے رسولؐ کے سامنے‘ یہی لوگ ہیں جن کے دلوں کو اللہ نے جانچ پرکھ کر چُن لیا ہے تقویٰ کے لیے۔‘‘

پچھلی آیت میں جو حکم منفی انداز میں دیا گیا ہے اسی حکم کو اب شاباش کے لیے مثبت انداز میں دہرایا گیا ہے۔ یعنی اللہ تعالیٰ کو اپنے رسول ﷺ کے ادب کے حوالے سے آپؐ کے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا طرزِ عمل اس قدر پسند آیا ہے کہ اس بنیاد پر اُس نے ان کے دلوں کو تقویٰ کے نور سے خصوصی طور پر منور کرنے کے لیے منتخب کر لیا ہے۔

﴿لَهُمۡ مَّغۡفِرَةٌ وَّاَجۡرٌ عَظِيۡمٌ ۝۳﴾ ’’ان کے لیے مغفرت بھی ہے اور بہت بڑا اجر بھی۔‘‘

آیت ۴ ﴿اِنَّ الَّذِيۡنَ يُنَادُوۡنَكَ مِنۡ وَّرَآءِ الۡحُجُرٰتِ اَكۡثَرُهُمۡ لَا يَعۡقِلُوۡنَ ۝۴﴾ ’’بے شک وہ لوگ جو آپؐ کو پکارتے ہیں حجروں کے پیچھے سے ان میں سے اکثر وہ ہیں جو عقل نہیں رکھتے۔‘‘

بعض اوقات جب حضور ﷺ اپنے حجرۂ مبارک میں تشریف فرما ہوتے تو بدّو قسم کے لوگ باہر کھڑے ہو کر آپؐ کو آوازیں دینا شروع کر دیتے: ’’یَا مُحَمَّدُ اُخۡرُجۡ اِلَیۡنَا‘‘۔ حضور ﷺ کے گھر تشریف لے جانے‘ آرام فرمانے اور گھر سے باہر رونق افروز ہونے کے اپنے معمولات تھے۔ لہٰذا یہاں دوٹوک انداز میں بتا دیا گیا کہ وقت بے وقت گھر سے باہر

کھڑے ہو کر لوگوں کا آپؐ کو بے باکانہ انداز میں آوازیں دینے کا یہ طرزِ عمل اللہ تعالیٰ کو سخت ناپسند ہے۔ کسی کو گھر سے باہر بلانے کا یہ انداز اور طریقہ عام معاشرتی آداب کے بھی خلاف ہے۔

آیت ۵ ﴿وَلَوۡ اَنَّهُمۡ صَبَرُوۡا حَتّٰى تَخۡرُجَ اِلَيۡهِمۡ لَكَانَ خَيۡرًا لَّهُمۡ ؕ وَاللّٰهُ غَفُوۡرٌ رَّحِيۡمٌ ۝۵﴾ ’’اور اگر وہ صبر کرتے یہاں تک کہ آپؐ خود ان کے پاس نکل کر آ جاتے تو یہ ان کے حق میں بہتر ہوتا۔ بہرحال اللہ بہت بخشنے والا‘ بہت رحم کرنے والا ہے۔‘‘

چونکہ یہ لوگ آدابِ معاشرت سے ناآشنا ہیں اور یہ خلافِ ادب حرکت وہ جان بوجھ کر نہیں کرتے رہے ہیں اس لیے اپنے گزشتہ طرزِ عمل کے حوالے سے تو انہیں معافی کی توقع رکھنی چاہیے کہ اللہ تعالیٰ غفور اور رحیم ہے‘ لیکن آئندہ کسی سے ایسی کوئی حرکت سرزد نہیں ہونی چاہیے۔

آیات ۶ تا ۱۰

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ جَآءَكُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوۡۤا اَنۡ تُصِيۡبُوۡا قَوۡمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصۡبِحُوۡا عَلٰى مَا فَعَلۡتُمۡ نٰدِمِيۡنَ ۝۶ وَاعۡلَمُوۡۤا اَنَّ فِيۡكُمۡ رَسُوۡلَ اللّٰهِ ؕ لَوۡ يُطِيۡعُكُمۡ فِىۡ كَثِيۡرٍ مِّنَ الۡاَمۡرِ لَعَنِتُّمۡ وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيۡكُمُ الۡاِيۡمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِىۡ قُلُوۡبِكُمۡ وَكَرَّهَ اِلَيۡكُمُ الۡكُفۡرَ وَالۡفُسُوۡقَ وَالۡعِصۡيَانَ ؕ اُولٰٓئِكَ هُمُ الرّٰشِدُوۡنَ ۝۷ۙ فَضۡلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعۡمَةً ؕ وَاللّٰهُ عَلِيۡمٌ حَكِيۡمٌ ۝۸ وَاِنۡ طَآئِفَتٰنِ مِنَ الۡمُؤۡمِنِيۡنَ اقۡتَتَلُوۡا فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا ۚ فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ حَتّٰى تَفِيۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ ۚ فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹ اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝۱۰ۚ

آئندہ آیات میں آٹھ خصوصی احکام کا ذکر ہے۔ ان میں دو بڑے احکام ہیں اور چھ چھوٹے۔ بڑے اور چھوٹے کی یہ تقسیم مَیں نے اس بنیاد پر کی ہے کہ ان میں دو احکام ایسے ہیں جن میں سے پہلے حکم کے لیے تین اور دوسرے کے لیے دو آیات مختص کی گئی ہیں‘ جبکہ بعد کے چھ

احکام مجموعی طور پر دو آیات میں بیان ہوئے ہیں‘ یعنی ان میں سے تین تین احکام کو ایک ایک آیت میں جمع کر دیا گیا ہے۔ ان تمام احکام کا تعلق اسلامی معاشرے اور غلبۂ دین کے لیے کھڑی ہونے والی تنظیم کو مضبوط اور مربوط رکھنے سے ہے۔ اگر کوئی تنظیم خود مضبوط و مربوط نہیں ہو گی تو ظاہر ہے اس کی جدّوجُہد بھی کمزور اور غیر مؤثر رہے گی۔ بہرحال ان آٹھ احکام میں ایسے اصول دے دیے گئے ہیں جو کسی معاشرے اور جماعت کے لیے مفید ہو سکتے ہیں اور ان باتوں سے بچنے کی ترغیب دی گئی ہے جن سے کسی معاشرہ یا تنظیم کی وحدت میں رخنے پڑ سکتے ہیں۔ دو بڑے احکام میں سے پہلا حکم یہ ہے:

آیت ۶ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا﴾ ’’اے اہلِ ایمان! اگر تمہارے پاس کوئی فاسق شخص کوئی بڑی خبر لے کر آئے تو تم تحقیق کر لیا کرو‘‘

اگر خبر دینے والا شخص تمہارے خیال کے مطابق ’’متقی‘‘ نہیں ہے تو اس خبر کے مطابق کوئی اقدام کرنے سے پہلے اچھی طرح سے تحقیق کر لیا کرو۔ ہو سکتا ہے اس نے آپ کو غلط اطلاع دی ہو کہ فلاں قبیلہ تم لوگوں پر حملے کی تیاری کر رہا ہے اور آپ تحقیق کیے بغیر اس قبیلے پر خواہ مخواہ چڑھائی کر دو۔

﴿اَنْ تُصِيْبُوْا قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰي مَا فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ ۝۶﴾ ’’مبادا کہ تم جا پڑو کسی قوم پر نادانی میں اور پھر تمہیں اپنے کیے پر نادم ہونا پڑے۔‘‘

تاریخِ عالم گواہ ہے کہ افواہوں کی بنیاد پر کیے گئے اکثر اقدامات سے قوموں اور ملکوں کے مابین بڑے بڑے جھگڑوں نے جنم لیا ہے۔ اس لیے افواہوں کی بنیاد پر کوئی اقدام نہیں کرنا چاہیے۔ ہاں اگر خبر لانے والا شخص صاحبِ تقویٰ اور قابلِ اعتماد ہو تو دوسری بات ہے۔

آیت ۷ ﴿وَاعْلَمُوْٓا اَنَّ فِيْكُمْ رَسُوْلَ اللّٰهِ ۭ﴾ ’’اور جان لو کہ تمہارے مابین اللہ کا رسول موجود ہے۔‘‘

انسانی سطح پر حضور ﷺ کے مختلف لوگوں کے ساتھ مختلف رشتے تھے۔ مثلاً بعض خواتین کے آپؐ شوہر اور بعض کے باپ تھے۔ مَردوں میں سے بعض کے آپؐ داماد تھے‘ بعض کے بھتیجے اور بعض کے سسر تھے۔ چنانچہ اس حساس معاملے میں دوٹوک انداز میں متنبہ کر دیا گیا کہ خبردار! تم میں سے کوئی کسی وقت یہ حقیقت نہ بھولنے پائے کہ محمد بن عبداللہ جو تمہارے درمیان موجود ہیں

یہ اللہ کے رسول (ﷺ) ہیں۔ لہٰذا آپؐ کی یہ حیثیت تم میں سے ہر ایک کے سامنے ہر حال میں مقدم رہنی چاہیے۔ آپؐ کا کوئی رشتہ دار محض اپنے کسی مخصوص رشتے کی بنا پر آپؐ کے ساتھ کوئی معاملہ کرنے کا کبھی خیال بھی ذہن میں نہ لائے۔

﴿لَوْ يُطِيْعُكُمْ فِيْ كَثِيْرٍ مِّنَ الْاَمْرِ لَعَنِتُّمْ﴾ ’’اگر وہ تمہارا کہنا مانا کریں اکثر معاملات میں تو تم لوگ مشکل میں پڑ جاؤ‘‘

چنانچہ تم ہر معاملے میں رسول اللہ ﷺ کی مرضی اور منشاء کو پیش نظر رکھا کرو۔ آپؐ سے یہ توقع نہ رکھو کہ آپؐ فیصلے کرتے ہوئے تم لوگوں کی مرضی کا خیال رکھیں گے۔

﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ’’لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر کھبا دیا ہے‘‘

﴿وَكَرَّهَ اِلَيْكُمُ الْكُفْرَ وَالْفُسُوْقَ وَالْعِصْيَانَ ۭ﴾ ’’اور اُس نے تمہارے نزدیک بہت ناپسندیدہ بنا دیا ہے کفر‘ فسق اور نافرمانی کو۔‘‘

﴿اُولٰۗىِٕكَ هُمُ الرّٰشِدُوْنَ ۝۷﴾ ’’یہی لوگ ہیں جو صحیح راستے پر ہیں۔‘‘

صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کی شان کے حوالے سے قرآن کی یہ آیت خصوصی اہمیت اور عظمت کی حامل ہے۔

آیت ۸ ﴿فَضْلًا مِّنَ اللّٰهِ وَنِعْمَةً ۭ﴾ ’’اللہ کی طرف سے بہت بڑے فضل اور انعام کی بنا پر۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ ۝۸﴾ ’’اور اللہ ہر چیز کا علم رکھنے والا‘ کمال حکمت والا ہے۔‘‘

اس کے بعد اب دوسرا حکم دیا جا رہا ہے:

آیت ۹ ﴿وَاِنْ طَاۗىِٕفَتٰنِ مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اقْتَتَلُوْا فَاَصْلِحُوْا بَيْنَهُمَا ۚ﴾ ’’اور اگر اہلِ ایمان میں سے دو گروہ آپس میں لڑ پڑیں تو ان کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔‘‘

اہلِ ایمان بھی تو آخر انسان ہیں۔ ان کے درمیان بھی اختلافات ہو سکتے ہیں اور کسی خاص صورت حال میں اختلافات بڑھ کر جنگ اور قتال پر بھی منتج ہو سکتے ہیں۔ جیسے کہ حضرت علی رضی اللہ عنہ اور حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کے درمیان یا حضرت علی رضی اللہ عنہ اور امیر معاویہ رضی اللہ عنہ کے درمیان اختلافات

جنگ کی شکل اختیار کر گئے تھے۔ چنانچہ اگر کہیں ایسی صورت حال پیدا ہو تو اُمّتِ مُسلمہ کے تمام افراد پر یہ ذِمّہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ متحارب فریقین کے درمیان صلح کروائیں۔ اگر مسلمانوں کے دو فریق آپس میں لڑ رہے ہوں تو باقی مسلمان خاموش تماشائی بن کر نہیں بیٹھ سکتے‘ کیونکہ اگر ان کے درمیان صلح نہ کرائی گئی تو مسلمانوں کی جمعیت اور طاقت میں رخنہ پڑے گا جس کی وجہ سے بالآخر مسلمانوں کی مجموعی طاقت اور غلبۂ دین کی جدّوجُہد کو نقصان پہنچے گا۔ اس لحاظ سے کسی بھی ملک یا خطہ کے مسلمانوں کے باہمی جھگڑوں کو ختم کرانا باقی مسلمانوں کا دینی فریضہ ہے۔

﴿فَاِنۡۢ بَغَتۡ اِحۡدٰىهُمَا عَلَى الۡاُخۡرٰى فَقَاتِلُوا الَّتِىۡ تَبۡغِىۡ﴾ ’’پھر اگر ان میں سے ایک فریق دوسرے پر زیادتی کر رہا ہو تو تم جنگ کرو اس کے ساتھ جو زیادتی کر رہا ہے‘‘

اگر فریقین میں صلح کرا دی گئی‘ لیکن اس کے بعد بھی ان میں سے ایک فریق اس صلح کی پابندی نہیں کر رہا اور دوسرے فریق پر زیادتی کیے جا رہا ہے تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ پوری اُمّتِ مُسلمہ پر زیادتی کر رہا ہے اور پوری ملّت اسلامیہ کو چیلنج کر رہا ہے۔ لہٰذا ایسی صورت میں پوری ملّت کی ذِمّہ داری ہے کہ وہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف بھرپور طاقت استعمال کرے۔

﴿حَتّٰى تَفِىۡٓءَ اِلٰٓى اَمۡرِ اللّٰهِ‌ۚ﴾ ’’یہاں تک کہ وہ لوٹ آئے اللہ کے حکم کی طرف۔‘‘

﴿فَاِنۡ فَآءَتۡ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَهُمَا بِالۡعَدۡلِ وَاَقۡسِطُوۡا‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الۡمُقۡسِطِيۡنَ ۝۹﴾ ’’پھر اگر وہ لوٹ آئے تو ان دونوں کے درمیان صلح کرا دو عدل کے ساتھ اور دیکھو! انصاف کرنا۔ بے شک اللہ انصاف کرنے والوں کو محبوب رکھتا ہے۔‘‘

کہیں ایسا نہ ہو کہ زیادتی کرنے والے فریق کے خلاف طاقت کے استعمال کے دوران تم لوگ انصاف کا دامن ہاتھ سے چھوڑ بیٹھو۔ ایسا ہرگز نہیں ہونا چاہیے۔ طاقت کا یہ استعمال صرف انصاف کے تقاضے پورے کرنے کی حد تک ہو۔ ظاہر ہے ایک زیادتی کو روکنے کے لیے مزید کسی زیادتی کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔

آیت ۱۰ ﴿اِنَّمَا الۡمُؤۡمِنُوۡنَ اِخۡوَةٌ فَاَصۡلِحُوۡا بَيۡنَ اَخَوَيۡكُمۡ﴾ ’’یقیناً تمام اہلِ ایمان آپس میں بھائی بھائی ہیں‘ پس اپنے دو بھائیوں کے درمیان صلح کرا دیا کرو۔‘‘

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ لَعَلَّكُمۡ تُرۡحَمُوۡنَ ۝۱۰﴾ ’’اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ تا کہ تم پر رحم کیا جائے۔‘‘

جیسا کہ قبل ازیں ذکر ہو چکا ہے‘ ان دو بڑے احکام کے بعد اب چھ چھوٹے احکام اگلی دو آیات میں جمع کر دیے گئے۔ اس طرح کہ ہر آیت میں تین احکام ہیں۔ کسی معاشرے یا کسی تنظیم کے اندر انفرادی اور اجتماعی سطح پر جہاں بڑے بڑے اختلافات پیدا ہوتے ہیں وہاں ایسی غلط فہمیاں بھی پیدا ہوتی رہتی ہیں جو بظاہر بہت چھوٹی محسوس ہوتی ہیں‘ لیکن اگر انہیں معمولی سمجھتے ہوئے بروقت ان کا تدارک نہ کیا جائے تو منفی عوامل کی وجہ سے دلوں میں زخم بن جاتے ہیں۔

آیات ۱۱‘ ۱۲

يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ‌ۚ وَلَا تَلۡمِزُوۡۤا اَنۡفُسَكُمۡ وَلَا تَنَابَزُوۡا بِالۡاَلۡقَابِ‌ؕ بِئۡسَ الِاسۡمُ الۡفُسُوۡقُ بَعۡدَ الۡاِيۡمَانِ‌ۚ وَمَنۡ لَّمۡ يَتُبۡ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ ۝۱۱ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوا اجۡتَنِبُوۡا كَثِيۡرًا مِّنَ الظَّنِّ‌ اِنَّ بَعۡضَ الظَّنِّ اِثۡمٌ وَّلَا تَجَسَّسُوۡا وَلَا يَغۡتَبۡ بَّعۡضُكُمۡ بَعۡضًا‌ؕ اَيُحِبُّ اَحَدُكُمۡ اَنۡ يَّاۡكُلَ لَحۡمَ اَخِيۡهِ مَيۡتًا فَكَرِهۡتُمُوۡهُ‌ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ‌ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِيۡمٌ ۝۱۲

آیت ۱۱ ﴿يٰۤاَيُّهَا الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا لَا يَسۡخَرۡ قَوۡمٌ مِّنۡ قَوۡمٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُوۡنُوۡا خَيۡرًا مِّنۡهُمۡ﴾ ’’اے اہلِ ایمان! تم میں سے کوئی گروہ دوسرے گروہ کا مذاق نہ اڑائے‘ ہو سکتا ہے کہ وہ ان سے بہتر ہوں‘‘

ممکن ہے مدِّمقابل شخص کی کوئی خوبی اس کے ظاہری عیب کے مقابلے میں بہت بڑی ہو۔ مثلاً آپ جس شخص کی بھدی ناک یا چھوٹے کان کا مذاق اڑا رہے ہوں ممکن ہے اس کے دل کا تقویٰ تمہارے تقویٰ کے مقابلے میں دس گنا زیادہ ہو۔ یا ممکن ہے وہ تمہارے مقابلے میں اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے ہزار گنا زیادہ محبت کرتا ہو۔

﴿وَلَا نِسَآءٌ مِّنۡ نِّسَآءٍ عَسٰٓى اَنۡ يَّكُنَّ خَيۡرًا مِّنۡهُنَّ‌ۚ﴾ ’’(اسی طرح) عورتیں بھی دوسری عورتوں کا مذاق نہ اڑائیں‘ ہو سکتا ہے وہ ان سے بہتر ہوں۔‘‘

گویا پہلے حکم میں مسلمان مَردوں اور عورتوں کو اپنے اپنے حلقوں میں ایک دوسرے کا مذاق اور تمسخر اڑانے سے منع کیا گیا ہے۔ اب اس سلسلے کا دوسرا حکم ملاحظہ ہو:

﴿وَلَا تَلْمِزُوْٓا اَنْفُسَكُمْ﴾ ’’اور اپنے آپ کو عیب مت لگاؤ‘‘

اپنے بھائی بندوں پر عیب لگانے سے منع کرنے کا یہ بہت ہی بلیغ انداز ہے کہ اپنے آپ کو عیب نہ لگاؤ۔ یعنی کسی کو عیب لگانے سے پہلے یہ ضرور سوچ لو کہ وہ تمہاری اپنی ہی ملّت کا ایک فرد ہے اور اپنی ملّت کے کسی فرد کو عیب لگانا گویا خود اپنے آپ ہی کو عیب لگانے کے مترادف ہے۔

﴿وَلَا تَنَابَزُوْا بِالْاَلْقَابِ ؕ﴾ ’’اور نہ آپس میں ایک دوسرے کے چڑانے والے نام رکھا کرو۔‘‘

یہ تیسرا حکم ہے کہ کسی فرد یا کسی گروہ کے اصل نام کو چھوڑ کر اس کے لیے کوئی ایسا نام نہ رکھ لو جو اسے پسند نہ ہو۔ یہ ایک مذموم اور ناپسندیدہ حرکت ہے۔

﴿بِئْسَ الِاسْمُ الْفُسُوْقُ بَعْدَ الْاِيْمَانِ ۚ﴾ ’’ایمان کے بعد تو برائی کا نام بھی برا ہے۔‘‘

تم تو وہ لوگ ہو جن کے دل ایمان کے نور سے منور ہو چکے ہیں۔ یہ بہت بڑی فضیلت ہے جس سے اللہ تعالیٰ نے تم لوگوں کو نوازا ہے۔ ایسے اعلیٰ مقام و مرتبے پر فائز ہو جانے کے بعد ایسی گھٹیا حرکات کا ارتکاب اب تمہارے شایانِ شان نہیں۔

﴿وَمَنْ لَّمْ يَتُبْ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الظّٰلِمُوْنَ ۝۱۱﴾ ’’اور جو باز نہیں آئیں گے وہی تو ظالم ہیں۔‘‘

پچھلے فقرے میں معیوب روش کو ترک کرنے کے لیے ترغیب و تشویق کی جھلک تھی جبکہ ان الفاظ میں اس روش سے تائب ہو کر باز نہ آنے والوں کے لیے زجر و توبیخ کا انداز پایا جاتا ہے۔ ممکن ہے کوئی شخص بادیٔ النظر میں مذکورہ برائیوں کو معمولی سمجھے‘ لیکن کسی معاشرے یا تنظیم میں ایسی برائیوں کا عادتاً رائج ہو جانا انتہائی نقصان دہ ہے۔

گزشتہ آیت میں جن تین برائیوں کا ذکر ہوا ہے ان کا ارتکاب عام طور پر دوسرے فریق کے روبرو کیا جاتا ہے‘ جبکہ اگلی آیت میں تین ایسے رذائل سے بچنے کا حکم دیا جا رہا ہے جو عموماً کسی فرد کی پیٹھ پیچھے سرزد ہوتے ہیں۔

آیت ۱۲ ﴿يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوا اجْتَنِبُوْا كَثِيْرًا مِّنَ الظَّنِّ ۫ اِنَّ بَعْضَ الظَّنِّ اِثْمٌ﴾

’’اے اہلِ ایمان! زیادہ گمان کرنے سے بچو‘ بے شک بعض گمان گناہ ہوتے ہیں‘‘

کسی کے بارے میں خواہ مخواہ کوئی بات فرض کر کے یا کسی سنی سنائی بات کو بنیاد بنا کر کوئی برا گمان اپنے دل میں بٹھا لینا اور منفی رائے قائم کر لینا جبکہ متعلقہ شخص نے نہ تو ویسا کوئی اقدام کیا ہو اور نہ ہی اس کے عملی رویے سے ویسی کسی بات کی تصدیق ہوتی ہو‘ یہ ہے اس گمان کی نوعیت جس سے یہاں منع کیا جا رہا ہے۔ ایسے گمان کو بدگمانی یا سوئے ظن کہا جاتا ہے اور یہ بہتان اور تہمت کے زمرے میں آتا ہے۔

﴿وَّلَا تَجَسَّسُوْا﴾ ’’اور ایک دوسرے کے حالات کی ٹوہ میں نہ رہا کرو‘‘

عام طور پر ریاستی اور حکومتی سطح پر جاسوسی کے باقاعدہ محکمے بھی ہوتے ہیں اور ظاہر ہے ضرورت کے تحت ایسا کوئی محکمہ ایک اسلامی حکومت کے تحت بھی قائم ہو سکتا ہے‘ لیکن اس حوالے سے جو بات معیوب اور ممنوع ہے وہ افراد کی سطح پر ایک دوسرے کے حالات کے بارے میں خواہ مخواہ کا تجسّس ہے۔ جیسے بعض لوگ عادتاً دوسروں کے معاملات کی ٹوہ میں رہتے ہیں اور کُرید کُرید کر جاننے کی کوشش کرتے ہیں کہ فلاں گھر کے اندر کیا ہو رہا ہے؟ فلاں دو بھائیوں کے معاملات کیا ہیں؟ اور کیا وجہ ہے کہ ابھی تک ان میں کوئی جھگڑا وغیرہ نہیں ہوا؟

﴿وَلَا يَغْتَبْ بَّعْضُكُمْ بَعْضًا ؕ﴾ ’’اور تم میں سے کوئی دوسرے کی غیبت نہ کرے۔‘‘

اس حکم کا تقاضا یہ ہے کہ کوئی شخص کسی دوسرے شخص کی غیر حاضری میں اس کی برائی بیان نہ کرے‘ خواہ وہ برائی اس شخص میں بالفعل پائی بھی جاتی ہو۔ رسول اللہ ﷺ نے غیبت کی تعریف ان الفاظ میں فرمائی ہے: ((ذِكْرُكَ اَخَاكَ بِمَا يَكْرَهُ)) ’’تمہارا اپنے بھائی کا ذکر اس انداز سے کرنا جسے وہ ناپسند کرے‘‘۔ آپؐ سے پوچھا گیا: ’’دیکھئے‘ اگر میرے بھائی میں وہ برائی واقعتاً پائی جاتی ہو جس کا میں ذکر کرتا ہوں (پھر بھی یہ غیبت ہے)؟‘‘ آپؐ نے ارشاد فرمایا: ((اِنْ كَانَ فِيْهِ مَا تَقُوْلُ فَقَدِ اغْتَبْتَهٗ ‘ وَاِنْ لَمْ يَكُنْ فِيْهِ فَقَدْ بَهَتَّهٗ))[۲] ’’اگر وہ برائی اس میں موجود ہے جس کا تم ذکر کر رہے ہو تو تم نے اُس کی غیبت کی ہے‘ اور اگر وہ برائی اس

۲۔ صحیح مسلم‘ کتاب البر و الصلة‘ باب تحریم الغیبة‘ ح ۲۵۸۹۔

میں موجود ہی نہیں تب تو تم نے اس پر بہتان لگا دیا۔''

﴿اَیُحِبُّ اَحَدُکُمْ اَنْ یَّاْکُلَ لَحْمَ اَخِیْهِ مَیْتًا فَکَرِهْتُمُوْهُ ؕ﴾ ''کیا تم میں سے کوئی شخص پسند کرے گا کہ اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھائے؟ یہ تو تمہیں بہت ناگوار لگا!''

یعنی مُردہ بھائی کے گوشت کھانے والی بات یا مثال سے تو تمہیں بہت گھن محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یاد رکھو! اگر تم اپنے کسی مسلمان بھائی کی غیبت کرتے ہو تو اخلاقی سطح پر یہ حرکت اپنے مُردہ بھائی کا گوشت کھانے کے ہی مترادف ہے۔ کیونکہ ایسی حرکت کا ارتکاب کر کے آپ اپنے بھائی کی عزت پر ایسی حالت میں حملہ کرتے ہیں جب وہ اس کا دفاع بھی نہیں کر سکتا۔ اگر تم اس کے سامنے اس کی برائی بیان کرتے تو وہ تمہارے الزامات کا ضرور جواب دیتا اور سو طرح سے اپنا دفاع کرتا۔ بہرحال کسی کی عدم موجودگی میں اسے برا بھلا کہنا ایسے ہے جیسے اس کی لاش آپ کے سامنے ہو اور آپ اس کی بوٹیاں نوچ رہے ہوں۔

﴿وَاتَّقُوا اللّٰهَ ؕ اِنَّ اللّٰهَ تَوَّابٌ رَّحِیْمٌ ﴿۱۲﴾﴾ ''اور اللہ کا تقویٰ اختیار کرو‘ اللہ توبہ کا بہت قبول فرمانے والا اور بہت رحم فرمانے والا ہے۔''

اس کے بعد اس سورت کا تیسرا حصّہ شروع ہو رہا ہے جو بہت اہم اور عظیم مضامین پر مشتمل ہے۔ یہاں پر ضمنی طور پر یہ نکتہ بھی نوٹ کر لیں کہ گزشتہ بارہ آیات میں اہلِ ایمان کو پانچ مرتبہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کے الفاظ میں مخاطب کیا گیا ہے۔ دوسری طرف ہم دیکھتے ہیں کہ پورے مکّی قرآن میں یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا کا صیغہ گویا ہے ہی نہیں۔ بہرحال اب اس مدنی سورت میں بھی خطاب کا رخ نوعِ انسانی کی طرف پھیرا جا رہا ہے:

آیات ۱۳ تا ۱۸

یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی وَ جَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّ قَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ اِنَّ اَکْرَمَکُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىکُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَلِیْمٌ خَبِیْرٌ ﴿۱۳﴾ قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَ لٰکِنْ قُوْلُوْۤا اَسْلَمْنَا وَلَمَّا یَدْخُلِ الْاِیْمَانُ فِیْ قُلُوْبِکُمْ ؕ وَ اِنْ تُطِیْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا یَلِتْکُمْ مِّنْ اَعْمَالِکُمْ شَیْـًٔا ؕ اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ

رَّحِیْمٌ ﴿۱۴﴾ اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَ رَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ یَرْتَابُوْا وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَ اَنْفُسِهِمْ فِیْ سَبِیْلِ اللّٰهِ ؕ اُولٰٓىِٕکَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ﴿۱۵﴾ قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِیْنِکُمْ ؕ وَ اللّٰهُ یَعْلَمُ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَ مَا فِی الْاَرْضِ ؕ وَ اللّٰهُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ ﴿۱۶﴾ یَمُنُّوْنَ عَلَیْکَ اَنْ اَسْلَمُوْا ؕ قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَیَّ اِسْلَامَکُمْ ۚ بَلِ اللّٰهُ یَمُنُّ عَلَیْکُمْ اَنْ هَدٰىکُمْ لِلْاِیْمَانِ اِنْ کُنْتُمْ صٰدِقِیْنَ ﴿۱۷﴾ اِنَّ اللّٰهَ یَعْلَمُ غَیْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ؕ وَاللّٰهُ بَصِیْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾

آیت ۱۳ ﴿یٰۤاَیُّهَا النَّاسُ اِنَّا خَلَقْنٰکُمْ مِّنْ ذَکَرٍ وَّاُنْثٰی﴾ ''اے لوگو! ہم نے تمہیں پیدا کیا ہے ایک مرد اور ایک عورت سے''

تم میں سے چاہے کوئی مؤمن ہے یا کوئی کافر و مشرک لیکن تم سب آدمؑ اور حوا کی ہی اولاد ہو۔

﴿وَجَعَلْنٰکُمْ شُعُوْبًا وَّقَبَآىِٕلَ لِتَعَارَفُوْا ؕ﴾ ''اور ہم نے تمہیں مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ تم ایک دوسرے کو پہچان سکو۔''

ایک ماں باپ کی اولاد ہونے کی بنا پر اگر تمام انسان ایک رنگ اور ایک جیسی شکل وصورت کے حامل ہوتے تو ان کی پہچان مشکل ہو جاتی۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے ہر انسان کو دوسرے سے مختلف بنایا ہے اور پھر انہیں رنگ‘ نسل‘ زبان وغیرہ کی بنیاد پر مختلف قوموں اور قبیلوں میں تقسیم کر دیا ہے تاکہ کروڑوں‘ اربوں انسانوں کی پہچان اور تعارف میں کسی سطح پر کوئی مشکل پیش نہ آئے۔

یہاں دراصل اس اہم نکتے کی طرف توجّہ دلانا مقصود ہے کہ انسانوں کے درمیان رنگ و نسل کا فرق اور اقوام وقبائل میں ان کی تقسیم‘ اعلیٰ وادنیٰ کی تمیز وتفریق کے لیے نہیں بلکہ ان کی باہمی جان پہچان اور تعارف کے لیے ہے۔ رسول اللہ ﷺ نے خطبہ حجۃ الوداع میں اس مضمون کی وضاحت ان الفاظ میں فرمائی:

((یَا اَیُّهَا النَّاسُ! اَلَا اِنَّ رَبَّکُمْ وَاحِدٌ وَاِنَّ اَبَاکُمْ وَاحِدٌ ' اَلَا لَا فَضْلَ لِعَرَبِیٍّ عَلٰی اَعْجَمِیٍّ وَلَا لِعَجَمِیٍّ عَلٰی عَرَبِیٍّ وَلَا لِاَحْمَرَ ' عَلٰی اَسْوَدَ وَلَا اَسْوَدَ عَلٰی اَحْمَرَ ' اِلَّا بِالتَّقْوٰی)) (۳)

۳۔ مسند احمد‘ کتاب باقی مسند الانصار‘ ح ۲۲۹۷۸۔ عن ابی نضرۃ رضی اللہ عنہ۔

''لوگو! آگاہ ہو جاؤ' یقیناً تمہارا رب ایک ہے اور تمہارا باپ بھی ایک ہے۔ خبردار! نہ کسی عربی کو کسی عجمی پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی عجمی کو کسی عربی پر۔ اور نہ کسی گورے کو کسی کالے پر کوئی فضیلت حاصل ہے اور نہ کسی کالے کو کسی گورے پر۔ فضیلت کی بنیاد صرف تقویٰ ہے۔''

ایچ جی ویلز (۱۸۶۶ء۔۱۹۴۶ء) اپنی کتاب A Concise History of the World میں حضور ﷺ کے خطبہ مبارک کے یہ الفاظ نقل کرنے کے بعد گھٹنے ٹیک کر آپؐ کو خراجِ تحسین پیش کرنے پر مجبور ہو گیا ہے۔ چنانچہ عیسائی ہونے کے باوجود اُس نے لکھا ہے:

''اگرچہ انسانی اخوت' مساوات اور حریت کے وعظ تو دنیا میں پہلے بھی بہت کہے گئے تھے اور ایسے وعظ ہمیں مسیح ناصری کے ہاں بھی بہت ملتے ہیں' لیکن یہ تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ یہ محمد (ﷺ) ہی تھے جنہوں نے تاریخِ انسانی میں پہلی بار ان اصولوں پر ایک معاشرہ قائم کیا۔''

H.G.Wells کے اس تبصرے سے یہ نہ سمجھا جائے کہ وہ حضور ﷺ کا بہت بڑا مدّاح تھا' بلکہ اس نے اپنی اسی کتاب میں حضور ﷺ کی شخصیت پر بہت رکیک حملے بھی کیے ہیں۔ اس حوالے سے اس کا انداز سلمان رشدی ملعون سے ملتا جلتا ہے' لیکن اپنے تمام تر تعصب کے باوجود اسے حضور ﷺ کے حوالے سے تاریخ کی یہ عظیم حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔ مقامِ افسوس ہے کہ بعد کے ایڈیٹرز نے مصنف کے اس اعترافی بیان کو مذکورہ کتاب سے خارج کر دیا ہے۔ اس لیے مذکورہ اقتباس کی تصدیق کے خواہش مند حضرات کو کسی لائبریری سے اس کتاب کا کوئی پرانا ایڈیشن تلاش کرنا پڑے گا۔

﴿اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰىكُمْ ؕ﴾ ''یقیناً تم میں سب سے زیادہ باعزّت اللہ کے ہاں وہ ہے جو تم میں سب سے بڑھ کر متقی ہے۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ عَلِيْمٌ خَبِيْرٌ ﴿۱۳﴾﴾ ''یقیناً اللہ سب کچھ جاننے والا' ہر چیز سے باخبر ہے۔''

آیت ۱۴ ﴿قَالَتِ الْاَعْرَابُ اٰمَنَّا ؕ﴾ ''یہ بدّو کہہ رہے ہیں کہ ہم ایمان لے آئے ہیں۔''

﴿قُلْ لَّمْ تُؤْمِنُوْا وَلٰكِنْ قُوْلُوْٓا اَسْلَمْنَا﴾ ''(اے نبی ﷺ ان سے) کہہ دیجیے: تم ہرگز ایمان نہیں لائے ہو' بلکہ تم یوں کہو کہ ہم مسلمان (اطاعت گزار) ہو گئے ہیں''

''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' میں نفی جحد بِلَمْ کا نہایت مؤکّد اسلوب ہے' یعنی یہاں مضارع سے پہلے لَمْ تاکیدی نفی کے لیے آیا ہے۔ چنانچہ ''لَمْ تُؤْمِنُوْا'' میں جو خاص تاکید پائی جاتی ہے وہ ''مَا آمَنْتُمْ'' جیسے الفاظ میں نہیں۔

﴿وَلَمَّا يَدْخُلِ الْاِيْمَانُ فِيْ قُلُوْبِكُمْ ؕ﴾ ''اور ایمان ابھی تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔''

اس آیت میں جو نکتہ بیان ہوا ہے وہ اسلامی معاشرے کی رکنیت اور اسلامی ریاست کی شہریت کے لیے بنیاد فراہم کرتا ہے۔ ایمان دراصل ایک نظریے کا نام ہے جو دل کے اندر چھپا ہوتا ہے۔ دنیا میں کسی بھی طریقے یا ذریعے سے کسی شخص کے ایمان کی تصدیق یا تردید نہیں ہو سکتی۔ اس لیے اسلامی معاشرے کے افراد یا اسلامی ریاست کے شہریوں کی قانونی حیثیت کا تعیّن ''اسلام'' کی بنیاد پر ہوگا نہ کہ ''ایمان'' کی بنیاد پر۔ البتہ آخرت میں اللہ کے ہاں ہر شخص کے معاملات کا فیصلہ ایمان کی بنیاد پر کیا جائے گا۔ چنانچہ ہمارے ہاں مردم شماری کے فارم کے اندر مذہب کے خانے میں کسی کے لیے ''مسلم'' کا لفظ لکھ دینے سے متعلقہ شخص کو قانونی طور پر تو مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا لیکن دنیا میں قانونی طور پر مسلمان بن جانے سے اللہ کے ہاں چھوٹ نہیں ہو سکتی۔ اللہ تعالیٰ تو ہر شخص کے دل میں ایمان کی کیفیت کو دیکھے اور پرکھے گا۔ جیسا کہ حضور ﷺ کا فرمان ہے: ((اِنَّ اللّٰهَ لَا يَنْظُرُ اِلٰى صُوَرِكُمْ وَاَمْوَالِكُمْ ' وَلٰكِنْ يَنْظُرُ اِلٰى قُلُوْبِكُمْ وَاَعْمَالِكُمْ)) (۴) ''اللہ تعالیٰ تمہاری صورتوں اور تمہارے اموال کو نہیں دیکھتا' بلکہ وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے اعمال کو دیکھتا ہے''۔ چنانچہ دُنیوی قانون کے تقاضوں اور نجاتِ اُخروی کے حوالے سے ایمان اور اسلام کے فرق کو سمجھنا بہت ضروری ہے۔

﴿وَاِنْ تُطِيْعُوا اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ لَا يَلِتْكُمْ مِّنْ اَعْمَالِكُمْ شَيْـًٔا ؕ﴾ ''لیکن اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو وہ تمہارے اعمال میں سے کوئی کمی نہیں کرے گا۔''

﴿اِنَّ اللّٰهَ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۱۴﴾﴾ ''یقیناً اللہ بہت بخشنے والا' بہت مہربان ہے۔''

اگرچہ اللہ تعالیٰ کے قانون کے مطابق اعمال کا دارومدار ایمان پر ہے' یعنی جب تک کسی

۴۔ صحیح مسلم' کتاب البر و الصلة و الآداب' باب تحریم الظلم و خذله...

کے دل میں ایمان نہیں اللہ کے ہاں اس کا کوئی عمل قابل قبول نہیں‘ لیکن اللہ تعالیٰ غفورٌ رحیم ہے‘ اس نے اپنی شانِ غفاری و رحیمی کے طفیل تم لوگوں کو خصوصی رعایت عطا کی ہے‘ چنانچہ اگرچہ تم نے ایمان کا ابھی صرف زبانی اقرار ہی کیا ہے اور یہ ایمان ابھی تمہارے دلوں میں راسخ نہیں ہوا‘ پھر بھی اس اقرار کے بعد اگر تم لوگ اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت کرتے رہو گے تو اللہ تعالیٰ تمہارے اعمال کو شرفِ قبولیت بخشتا رہے گا۔ اس حوالے سے یہ اہم قانونی اور اصولی نکتہ ضرور مدِّنظر رہنا چاہیے کہ یہاں جس اطاعت کا ذکر ہے اس سے مراد کُلّی اطاعت ہے۔ کیونکہ ﴿اُدْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّۃً ص﴾ (البقرۃ:۲۰۸) کے واضح حکم کے بعد اسلام میں جزوی داخلہ اور اللہ تعالیٰ کی جزوی اطاعت قابلِ قبول ہی نہیں۔

آیت زیر مطالعہ اس لحاظ سے بہت اہم ہے کہ اس میں ایمان کو اسلام سے علیحدہ کر دیا گیا ہے اور یہ قرآن مجید کا واحد مقام ہے جہاں مسلمانوں کے ایک گروہ کو واضح طور پر بتا دیا گیا ہے کہ تاحال ایمان تمہارے دلوں میں داخل نہیں ہوا۔ اس سے بعض لوگوں کو یہ مغالطہ بھی ہوا کہ یہ آیت منافقین کے بارے میں ہے‘ حالانکہ اس بارے میں سب کا اتفاق ہے کہ منافقین کا تو کوئی عمل بھی اللہ کے ہاں قابل قبول نہیں‘ جبکہ یہاں متعلقہ لوگوں کو یقین دہانی کرائی جا رہی ہے کہ اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کوئی کمی نہیں کی جائے گی۔ چنانچہ اس حکم کا درست مفہوم سمجھنے کے لیے ان حالات کے بارے میں جاننا ضروری ہے جن حالات میں یہ آیت نازل ہوئی۔

جب اللہ تعالیٰ نے اپنے رسول ﷺ کو جزیرۃ العرب میں غلبہ عطا فرما دیا تو کفّار و مشرکین کے تمام قبائل پر یہ حقیقت واضح ہو گئی کہ اب ان میں مسلمانوں کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں رہی۔ دوسری طرف سورۃ التوبہ کی ابتدائی آیات میں ان کے لیے یہ الٹی میٹم بھی نازل ہو چکا تھا: ﴿فَاِذَا انْسَلَخَ الْاَشْہُرُ الْحُرُمُ فَاقْتُلُوا الْمُشْرِکِیْنَ حَیْثُ وَجَدْتُّمُوْھُمْ وَخُذُوْھُمْ وَاحْصُرُوْھُمْ وَاقْعُدُوْا لَھُمْ کُلَّ مَرْصَدٍ ج﴾ (آیت ۵) ’’اور جب یہ محترم مہینے گزر جائیں تو قتل کرو ان مشرکین کو جہاں پاؤ‘ اور پکڑو ان کو‘ اور گھیراؤ کرو ان کا‘ اور ان کے لیے ہر جگہ گھات لگا کر بیٹھو‘‘۔ ۹ ہجری کے حج کے موقع پر یہ الٹی میٹم ہر خاص و عام تک پہنچا بھی دیا گیا تھا۔ اس کے بعد متعلقہ لوگوں کے پاس صرف چار ماہ کا وقت تھا۔ ان حالات میں ان قبائل کے پاس اطاعت قبول کرنے

کے علاوہ دوسرا کوئی راستہ بچا ہی نہیں تھا۔ چنانچہ انہوں نے یہی راستہ اپنایا اور حضور ﷺ کی اطاعت قبول کرنے کے لیے آپؐ کی خدمت میں اپنے اپنے وفد بھیجنے شروع کر دیے۔ اس طرح اس سال مدینہ میں وفود کا تانتا بندھ گیا۔ گویا ہر قبیلہ اسلامی حکومت کی اطاعت قبول کرنے اور اسلام میں داخل ہونے کے لیے دوسروں پر سبقت لے جانا چاہتا تھا۔ اس صورت حال کا نقشہ سورۃ النصر میں یوں دکھایا گیا ہے: ﴿اِذَا جَآءَ نَصْرُ اللّٰہِ وَالْفَتْحُ ۝۱ وَرَاَیْتَ النَّاسَ یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا ۝۲﴾

اطاعت قبول کرنے والے ان لوگوں میں تین طرح کے افراد تھے۔ کچھ تو ظاہر ہے خلوصِ نیت سے ایمان لانے والے تھے اور کچھ منافق اور دھوکہ باز جو ہوا کا رخ دیکھ کر اپنے مسلمان ہونے کا اعلان کرنے پر مجبور تھے۔ لیکن ان دو اقسام کے درمیان تیسری قسم کے کچھ لوگ بھی تھے‘ جن کے دلوں میں نہ تو دھوکے کی نیت تھی اور نہ ہی ایمان لانے کا سچّا جذبہ تھا۔ یعنی وہ مثبت اور منفی دو انتہاؤں کے درمیان ’’زیرو پوائنٹ‘‘ پر کھڑے تھے۔ آیت زیر مطالعہ میں دراصل ان ہی لوگوں کا ذکر ہے۔ ان لوگوں کو نہ صرف اطمینان دلایا گیا کہ اگر تم لوگ اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت کرتے رہو گے تو تمہارے اعمال میں کچھ کمی نہیں کی جائے گی‘ بلکہ آگے آیت ۱۷ میں انہیں خوشخبری بھی سنا دی گئی کہ اگر تم خلوصِ دل سے اطاعت کے اس راستے پر چلتے رہو گے تو تمہارے دلوں میں سچّا اور حقیقی ایمان بھی پیدا ہو جائے گا۔

دراصل ایمانِ حقیقی اور عمل صالح باہم لازم و ملزوم ہیں۔ ایک طرف دل میں ایمانِ حقیقی کی موجودگی اگر اعمالِ صالحہ کے صدور کا باعث بنتی ہے تو دوسری طرف اعمالِ صالحہ کی مداومت بھی ایمان کی تقویت کے لیے بنیاد فراہم کرتی ہے۔ لیکن واضح رہے کہ اس حوالے سے ٹھوس نتائج کے لیے دل میں مضبوط ارادے اور نیت کا موجود ہونا ناگزیر ہے۔ یعنی دل میں پختہ نیت ہو کہ مجھے ایک سچّا اور پکّا مؤمن بننا ہے‘ مؤمن بن کر جینا ہے اور مؤمن کی حیثیت سے اس دنیا سے کوچ کرنا ہے۔ لیکن اس ضمن میں اس تلخ حقیقت کو بھی تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں کہ آج کل کے ماحول میں اول تو ایسی نیت یا آرزو کا دل میں پیدا ہونا ہی مشکل ہے‘ اور اگر کسی دل میں یہ آرزو پیدا ہو ہی جائے تو اس کا زندہ رہنا محال ہے۔ کیونکہ آج کا معاشرہ اور خارج کا موجودہ ماحول ایسی مثبت سوچ کو غذا فراہم نہیں کرتا اور ظاہر ہے جس ماحول میں آکسیجن نہیں ہو گی وہاں کوئی

تنفّس کیسے زندہ رہ سکے گا۔ اقبالؔ نے اس صورت حال کو اپنے الفاظ میں اس طرح بیان کیا ہے:

آرزو اوّل تو پیدا ہو نہیں سکتی کہیں
ہو کہیں پیدا تو مرجاتی ہے یا رہتی ہے خام!

بلکہ ہمارا موجودہ معاشرہ تو اس حوالے سے منفی کردار کے لیے غیر معمولی طور پر حسّاس اور فعّال ہے۔ ایسی کوئی آرزو کسی دل میں ابھی پوری طرح آنکھیں بھی نہیں کھولنے پاتی کہ ماحول کی تمام منفی قوتیں اپنے اپنے ہتھیار سجا کر اس جانِ ناتواں کے محاصرے کے لیے پہنچ جاتی ہیں۔ اس میں سب سے مؤثر کردار ''اپنوں'' کی ایسی نصیحتوں کا ہوتا ہے کہ دیکھو اپنے گھر بار کی بھی کچھ فکر کرو! کیوں تم اپنا بنا بنایا کیریئر تباہ کرنے پر تُل گئے ہو؟ کیا تمہیں اپنے مستقبل اور اپنے بیوی بچوں کا بھی خیال نہیں؟ وغیرہ وغیرہ۔ اس دباؤ کا فطری اور منطقی نتیجہ یہی نکلتا ہے کہ وہ ''نوزائیدہ آرزو'' لمحہ بہ لمحہ کمزور ہونے لگتی ہے اور بالآخر سسک سسک کر دم توڑ جاتی ہے' اِلّا یہ کہ کسی کے ارادے میں غیر معمولی خلوص و استقامت ہو اور اللہ کی خصوصی توفیق و نصرت بھی اس کے شامل حال ہو۔

بہر حال آیت زیر مطالعہ کے حوالے سے یہ بحث تو اسلام اور ایمان کے فرق سے متعلق تھی۔ لیکن اگر کوئی یہ جاننا چاہے کہ حقیقی مؤمن کسے کہتے ہیں تو وہ ''مؤمن'' کی اس تعریف (definition) کو اپنے پیش نظر رکھے جو اگلی آیت میں بیان کی گئی ہے۔ (اس مضمون کی وضاحت قبل ازیں سورۃ الانفال کی آیات ۲' ۳ اور ۴ کے ضمن میں بھی کی جا چکی ہے۔)

آیت ۱۵ ﴿اِنَّمَا الْمُؤْمِنُوْنَ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ ثُمَّ لَمْ يَرْتَابُوْا﴾ ''مؤمن تو بس وہی ہیں جو ایمان لائے اللہ اور اُس کے رسولؐ پر' پھر شک میں ہرگز نہیں پڑے''

یعنی ایسے لوگوں کا ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہو کر یقین کی ایسی صورت اختیار کر گیا ہے کہ ان کے دلوں کے اندر شک کی کوئی گنجائش رہی ہی نہیں۔ جیسے قبل ازیں آیت ۷ میں صحابہؓ کے بارے میں فرمایا گیا: ﴿وَلٰكِنَّ اللّٰهَ حَبَّبَ اِلَيْكُمُ الْاِيْمَانَ وَزَيَّنَهٗ فِيْ قُلُوْبِكُمْ﴾ ''لیکن (اے نبی ﷺ کے ساتھیو!) اللہ نے تمہارے نزدیک ایمان کو بہت محبوب بنا دیا ہے اور اسے تمہارے دلوں کے اندر رچا بسا دیا ہے۔''

جب تک ایمان دل میں راسخ نہیں ہوا اور ابھی صرف زبان پر ہے (آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...) تو یہ اسلام ہے۔ اسی لیے اسلام کی بنیاد جن پانچ چیزوں پر بتائی

گئی ہے: (بُنِيَ الْاِسْلَامُ عَلٰى خَمْسٍ... الحدیث) ان میں یقین قلبی شامل نہیں ہے' بلکہ نظریاتی طور پر صرف توحید و رسالت کی گواہی دے کر اور اس کے بعد نماز' روزہ' زکوٰۃ اور حج کا التزام کر کے اسلام کا تقاضا پورا ہو جاتا ہے۔ لیکن ایمان اس سے اوپر کی منزل ہے۔ گویا مذکورہ پانچ شرائط (پہلی شرط کا تعلق نظریے سے جبکہ باقی چار کا تعلق عمل سے ہے) پوری کر کے جو شخص ''مسلمان'' ہو گیا اسے ''مؤمن'' بننے کے لیے کچھ اضافی شرائط بھی پوری کرنا ہوں گی اور آیت زیر مطالعہ کی رو سے یہ اضافی دو شرائط ہیں' یعنی ''شہادت'' کے ساتھ یقین قلبی (لَمْ يَرْتَابُوْا) کی کیفیت کا اضافہ ہو گا اور اعمال کے ساتھ جہاد فی سبیل اللہ کا:

﴿وَجٰهَدُوْا بِاَمْوَالِهِمْ وَاَنْفُسِهِمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ؕ﴾ ''اور انہوں نے جہاد کیا اپنے مالوں اور اپنی جانوں کے ساتھ اللہ کی راہ میں۔''

﴿اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ ۝۱۵﴾ ''یہی لوگ ہیں جو (اپنے دعوائے ایمان میں) سچّے ہیں۔''

گویا کسی شخص کو ''حقیقی مؤمن'' بننے کے لیے مذکورہ ساتوں شرائط پوری کرنا ہوں گی۔ پہلی پانچ شرائط ''اسلام'' میں داخل ہونے کے لیے جبکہ آخری دو شرائط ''ایمان'' کی منزل حاصل کرنے کے لیے۔ اسلام اور ایمان کے اس فرق کو اس طرح بھی بیان کیا جا سکتا ہے کہ ایک مؤمن لامحالہ ''مسلم'' تو ہو گا ہی لیکن ہر ''مسلم'' مؤمن نہیں ہو سکتا۔

اسلام اور ایمان کی اس بحث میں لائق توجّہ نکتہ یہ ہے کہ زبان سے: ''آمَنْتُ بِاللّٰهِ وَمَلَائِكَتِهٖ وَكُتُبِهٖ وَرُسُلِهٖ...'' کا دعویٰ کرنا تو آسان ہے مگر دل میں حقیقی ایمان پیدا کرنا اور پھر اس ایمان کے تقاضے پورے کرنا انتہائی مشکل کام ہے۔ اس لیے ضروری ہے کہ ہم میں سے ہر ایک اپنی ''ایمانی کیفیت'' کا جائزہ لیتا رہے۔ خصوصی طور پر اس حوالے سے یہ حقیقت تو ہمیں کسی لمحے بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ ہم باطل نظام کے تحت زندگی بسر کر رہے ہیں۔ اس حالت میں اگر ہم اس نظام کو ذہنی طور پر قبول کر کے اس کی چاکری کرنا شروع کر دیں گے' یعنی اس نظام کے تحت اپنی معیشت کی ترقی اور اپنے معیارِ زندگی کو بہتر بنانے کی فکر میں لگ جائیں گے تو ایسی صورت میں ہمیں اپنے ایمان کی خبر لینے کی ضرورت ہو گی۔

دراصل کسی ملک یا معاشرے میں غلبہ باطل کی صورت میں ایک بندۂ مؤمن کے لیے لازم

ہے کہ وہ اس نظام کے تحت حالتِ احتجاج میں رہتے ہوئے زندگی بسر کرے۔ اور ((اَلدُّنْیَا سِجْنُ الْمُؤْمِنِ))[5] کے مصداق باطل نظام کے تحت وہ ایسے رہے جیسے ایک قیدی جیل کے اندر رہتا ہے۔ یعنی اپنی اور اپنے اہل وعیال کی ضروریات پوری کرنے میں وہ اپنی کم سے کم توانائی صَرف کرے اور ان ضروریات کو بھی کم سے کم معیار (subsistance level) پر رکھے‘ جبکہ اپنا باقی وقت اور اپنی بہترین صلاحیتیں نظامِ باطل کو جڑ سے اکھاڑ پھینکنے اور اللہ کے دین کو غالب کرنے کی جدّوجُہد میں کھپا دے۔ ع ’’گر یہ نہیں تو بابا پھر سب کہانیاں ہیں!‘‘ اگر باطل نظام کے تحت رہتے ہوئے ایک مردِ مسلمان کی زندگی کے شب و روز کا نقشہ ایسا نہیں تو بے شک قانونی طور پر وہ اپنے ملک کا ایک مسلمان شہری ہے‘ اپنے مسلمان باپ کی وراثت کا حقدار ہے‘ مسلمان عورت سے شادی کر سکتا ہے اور اس طرح کے دوسرے تمام قانونی حقوق سے بھی مستفید ہو سکتا ہے‘ لیکن ایسا ’’مسلمان‘‘ اللہ کے ہاں ’’مؤمن‘‘ شمار نہیں ہو سکتا۔

اس آیت کے بارے میں یہ نکتہ بھی اہم ہے کہ اس کا آغاز ’’اِنّما‘‘ سے ہو رہا ہے اور آخر پر ’’اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ‘‘ کے الفاظ آئے ہیں۔ یعنی آیت کا آغاز بھی اسلوبِ حصر سے ہو رہا ہے اور اختتام پر بھی اسلوبِ حصر آیا ہے۔ اس اعتبار سے آیت کا مفہوم یوں ہوگا کہ مؤمن تو ہیں ہی صرف وہ لوگ جن کے دلوں میں ایمان نے ’’یقین‘‘ کی شکل اختیار کر لی اور پھر انہوں نے اپنے جان و مال کو اللہ کی راہ میں کھپا دیا۔ اور صرف یہی لوگ ہیں جو اپنے ایمان کے دعوے میں سچّے ہیں۔ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ‘ اَللّٰھُمَّ رَبَّنَا اجْعَلْنَا مِنْھُمْ۔ آمین‘ ثم آمین!

آیت کے آخر میں ان مؤمنین کو جو سرٹیفکیٹ (اُولٰٓئِكَ هُمُ الصّٰدِقُوْنَ) عطا ہوا ہے اس کی اہمیت کو سورۃ التوبہ کی آیت ۱۱۹ کی روشنی میں سمجھنے کی ضرورت ہے۔ سورۃ التوبہ کی مذکورہ آیت میں اہلِ ایمان کو صادقین کے ساتھ شامل ہونے (كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ) کا حکم دیا گیا ہے‘ جبکہ آیت زیرِ مطالعہ میں یہ بتایا گیا ہے کہ ’’صادقین‘‘ کون ہیں۔ اس نکتے کو اس طرح سمجھیں کہ آیت زیرِ مطالعہ میں مؤمنینِ صادقین کی دو نشانیاں (ایمان حقیقی اور جہاد فی سبیل اللہ) ہماری راہنمائی کے لیے بتائی گئی ہیں کہ مسلمانو! اٹھو‘ اس ’’چراغ‘‘ کی روشنی میں ’’مؤمنینِ صادقین‘‘ کو تلاش کرو اور پھر ان کے مشن کی جدّوجُہد میں ان کے دست و بازو بن جاؤ! حضور ﷺ کا فرمان ہے کہ میری اُمّت میں سے ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا۔ امیر معاویہ رضی اللہ عنہ روایت کرتے ہیں کہ

۵۔ صحیح مسلم‘ کتاب الزھد‘ عن ابی ھریرۃ رضی اللہ عنہ‘ ح: ۲۹۵۶۔

رسول اللہ ﷺ نے ارشاد فرمایا: ((لَا یَزَالُ مِنْ اُمَّتِیْ اُمَّةٌ قَائِمَةٌ بِاَمْرِ اللّٰهِ ، لَا یَضُرُّهُمْ مَنْ خَذَلَهُمْ وَلَا مَنْ خَالَفَهُمْ، حَتّٰی یَاْتِیَ اَمْرُ اللّٰهِ وَهُمْ عَلٰی ذٰلِکَ)) [6] ’’میری اُمّت میں سے ایک گروہ اللہ کے حکم کو قائم کرنے والا ہمیشہ موجود رہے گا۔ ان کا ساتھ چھوڑ دینے والے اور ان کی مخالفت کرنے والے ان کا کچھ نہ بگاڑ سکیں گے‘ یہاں تک کہ اللہ کا حکم آ جائے گا‘ اور وہ اسی پر قائم ہوں گے‘‘۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ’’مؤمنینِ صادقین‘‘ آج بھی ہمارے درمیان موجود ہیں۔ ہمارا فرض ہے کہ ہم انہیں تلاش کریں اور ﴿كُوْنُوْا مَعَ الصّٰدِقِيْنَ﴾ کے حکم پر لبیک کہتے ہوئے ان کے جھنڈے تلے جمع ہو جائیں تاکہ ﴿مُحَمَّدٌ رَّسُوْلُ اللّٰهِ ۭ وَالَّذِيْنَ مَعَهٗ﴾ (الفتح:۲۹) کی طرز پر ایک مضبوط ’’حزب اللہ‘‘ تشکیل پا سکے۔ ظاہر ہے افراد کے اتحاد کے بغیر نہ تو کوئی جمعیت وجود میں آ سکتی ہے‘ نہ اقامتِ دین کی جدّوجُہد آگے بڑھ سکتی ہے اور نہ ہی ’’اظہارِ دینِ حق‘‘ کی شانِ تکمیلی کا ظہور ممکن ہو سکتا ہے۔

آیت ۱۶ ﴿قُلْ اَتُعَلِّمُوْنَ اللّٰهَ بِدِيْنِكُمْ ۭ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) ان سے کہیے: کیا تم اللہ کو جتلانا چاہتے ہو اپنا دین؟‘‘

مثل مشہور ہے ’’تھوتھا چنا باجے گھنا‘‘۔ یعنی جو برتن خالی ہوگا وہ کھنکھنانے پر بھرے ہوئے برتن کی نسبت زیادہ آواز دے گا۔ ان لوگوں کے دل چونکہ حقیقی ایمان سے خالی تھے اس لیے وہ اپنے ایمان کا بڑھ چڑھ کر پرچار کرتے تھے اور حضور ﷺ پر احسان دھرتے تھے کہ دیکھیں! ہم تو لڑے بھڑے بغیر اسلام لے آئے ہیں‘ اس لیے اب ہمارے حقوق بھی زیادہ ہونے چاہئیں۔

﴿وَاللّٰهُ يَعْلَمُ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۭ﴾ ’’اور اللہ جانتا ہے جو کچھ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ زمین میں ہے۔‘‘

﴿وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ ۝۱۶﴾ ’’اللہ تو ہر چیز کا علم رکھنے والا ہے۔‘‘

اگر حقیقی ایمان ان کے دلوں میں راسخ ہوتا تو انہیں یہ بھی یقین ہوتا کہ اللہ عالم الغیب ہے‘ دنیا و مافیہا کی ہر چیز اس کے علم میں ہے‘ اس لیے اس کے سامنے کسی کو اپنے ایمان کا ذکر کرنے کی ضرورت نہیں۔

آیت ۱۷ ﴿يَمُنُّوْنَ عَلَيْكَ اَنْ اَسْلَمُوْا ۭ﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) یہ لوگ آپ پر احسان

۶۔ صحیح البخاری‘ کتاب المناقب‘ باب سؤال المشرکین.....‘ ح ۳۶۴۱۔

دھر رہے ہیں کہ وہ اسلام لے آئے ہیں!‘‘

﴿قُلْ لَّا تَمُنُّوْا عَلَيَّ اِسْلَامَكُمْ ۚ﴾ ’’ان سے کہیے کہ مجھ پر اپنے اسلام کا احسان نہ دھرو۔‘‘

﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ﴿۱۷﴾﴾ ’’بلکہ اللہ تم پر احسان دھرتا ہے کہ اس نے تمہیں ایمان کے راستے پر ڈال دیا ہے‘ اگر تم سچّے ہو۔‘‘

اللہ تعالیٰ نے تمہیں توفیق دی کہ تم اسلام لے آئے۔ ابھی تم لوگ ایمان کے راستے پر آئے ہو۔ اگر تم اپنے اسلام کے دعوے میں سچّے ہو گے‘ نماز کی پابندی کرو گے‘ رمضان کے روزے رکھو گے‘ زکوٰۃ ادا کرو گے اور اعمالِ صالحہ کا اہتمام کرو گے تو ان اعمال کی نورانیت سے تمہارے دلوں کے اندر ایمان بھی پیدا ہو جائے گا۔ اس آیت میں اسلام اور ایمان کا فرق بہت واضح ہو گیا ہے۔ متعلقہ لوگوں کے دعوے کے حوالے سے یہاں دو دفعہ اسلام کا لفظ آیا ہے۔ لیکن بعد میں جب اللہ کی توفیق کے حوالے سے بات ہوئی ہے تو ایمان کا ذکر کیا گیا ہے: ﴿بَلِ اللّٰهُ يَمُنُّ عَلَيْكُمْ اَنْ هَدٰىكُمْ لِلْاِيْمَانِ﴾ یعنی یہ تو اللہ کا تم پر احسان ہے کہ اس نے تمہیں اسلام لانے کی توفیق دی اور یوں اس نے تمہیں ایمان کی شاہراہ پر ڈال دیا۔ اگر تم صدقِ دل سے اسلام لائے ہو تو یہ شاہراہ ضرور تمہیں ایمان کی منزل تک لے جائے گی۔ لیکن اگر تم منافق ہو یا صرف جان بچانے کے لیے اسلام کی پناہ میں آئے ہو تو قانونی طور پر بے شک تمہارا شمار مسلمانوں میں ہو جائے گا لیکن اللہ کے ہاں نہ تمہارا اسلام قبول ہو گا اور نہ ایمان۔

جیسا کہ قبل ازیں بھی ذکر ہوا ہے‘ اس ضمن میں قانون یہی ہے کہ جو کوئی بھی زبان سے توحید و رسالت کی گواہی دے کر مسلمان ہونے کا دعویٰ کرے گا اسے مسلمان تسلیم کر لیا جائے گا۔ اسی قانون کے تحت غزوۂ تبوک تک تمام منافقین کو بھی مسلمان تسلیم کیا جاتا رہا۔ یہاں تک کہ حضور ﷺ نے رئیس المنافقین عبداللہ بن اُبی کی نماز جنازہ بھی پڑھائی۔ البتہ غزوۂ تبوک کے بعد ان کی منافقت کا پردہ چاک کیا گیا اور ان کی بنائی ہوئی مسجد (مسجد ضرار) بھی گرا دی گئی۔

آیت ۱۸ ﴿اِنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ غَيْبَ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۭ وَاللّٰهُ بَصِيْرٌۢ بِمَا تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۸﴾﴾

’’یقیناً اللہ جانتا ہے آسمانوں اور زمین کی چھپی ہوئی چیزیں۔ اور جو کچھ تم کر رہے ہو اللہ اسے بھی دیکھ رہا ہے۔‘‘ ❁❁

نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم بحیثیت منتظم

ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ

[ایک تقریر جو ریڈیو پاکستان لاہور کے پروگرام ''خیر البشر صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم'' کے سلسلے میں ۷/ربیع الاول ۱۳۹۹ھ کو نشر ہوئی]

احمدہٗ واُصلّی علٰی رسولہ الکریم —— امّا بعد:
فَاَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ - بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

ہمارا ایمان ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم صرف ایک نبی ہی نہیں ''خاتم النّبیّین'' ہیں اور صرف ایک رسول ہی نہیں ''آخر المرسلین'' ہیں۔ اس طرح جہاں نفسِ نبوت آنحضور صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم اور جملہ انبیاء ورسل علیہم السلام کے مابین ایک قدرِ مشترک ہے' وہاں ختمِ نبوّت آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کا وہ امتیازی وصف ہے جس میں کوئی دوسرا نبی یا رسول آپؐ کا شریک و ہمسر نہیں۔ گویا اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی مبارک شخصیت میں اللہ تعالیٰ کی شانِ یکتائی کا ایک پرتو بتمام و کمال موجود ہے۔ مزید برآں آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی ذاتِ مبارکہ پر نبوت ختم ہی نہیں ہوئی' مرتبۂ اِتمام و اِکمال کو بھی پہنچی ہے اور آپؐ کی ذاتِ والا صفات پر رسالت کا سلسلہ منقطع ہی نہیں ہوا درجۂ تکمیل کو بھی پہنچا ہے۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ کے اس اٹل فیصلہ کا اظہار و اعلان —— کہ آپؐ پر نُورِ نبوت و رسالت کا اِتمام و اِکمال بھی ہو کر رہے گا اور نعمتِ شریعت و ہدایت کی تکمیل بھی —— زبانِ وحی سے بار بار ہوتا رہا۔ جیسے سورۃ الصف میں فرمایا: ﴿وَاللّٰہُ مُتِمُّ نُوْرِہٖ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۸﴾﴾ ''اللہ اپنے نُور کا اتمام فرما کر رہے گا خواہ یہ کافروں کو کتنا ہی ناگوار ہو''۔ اور سورۃ التوبہ میں فرمایا: ﴿وَیَاْبَی اللّٰہُ اِلَّآ اَنْ یُّتِمَّ نُوْرَہٗ وَلَوْ کَرِہَ الْکٰفِرُوْنَ ﴿۳۲﴾﴾ ''اللہ کو ہرگز منظور نہیں مگر یہ کہ وہ اپنے نُور کا اِتمام فرما کر رہے گا خواہ کافر

کتنا ہی ناپسند کریں''۔ اور اس پر آخری مہر تصدیق ثبت کر دی اس آیۂ مبارکہ نے جو عین حجۃ الوداع کے موقع پر نازل ہوئی: ﴿اَلْیَوْمَ اَکْمَلْتُ لَکُمْ دِیْنَکُمْ وَاَتْمَمْتُ عَلَیْکُمْ نِعْمَتِیْ﴾ (المائدۃ:۳) ''آج کے دن میں نے تمہارے لیے تمہارے دین کو کامل کر دیا اور تم پر اپنی نعمت کا اتمام فرما دیا''۔ فَلَـہُ الْحَمْدُ وَالْمِنَّۃ!!

اب اس پر غور فرمایئے کہ نفسِ نبوت اور ختمِ نبوت کے اعتبار سے نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی بعثت اور بنا بریں آپؐ کی شخصیت کے دو پہلو ہیں:

(۱) نفسِ نبوت کی رعایت سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم شاہد بھی تھے اور بشیر و نذیر بھی' بفحوائے الفاظِ قرآنی: ﴿یٰٓاَیُّہَا النَّبِیُّ اِنَّآ اَرْسَلْنٰکَ شَاہِدًا وَّمُبَشِّرًا وَّنَذِیْرًا ﴿۴۵﴾﴾ (الاحزاب) داعی بھی تھے اور مبلغ و مذکر بھی' معلّم بھی تھے اور مربّی و مزکّی بھی —— اور اس اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کی عظمت کا مظہرِ اتم وہ نفوسِ قدسیہ ہیں جو آپؐ کی دعوت و تبلیغ اور تعلیم و تربیت کے ذریعے تیار ہوئے' جنہیں ہم صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے نام سے یاد کرتے ہیں اور جن سے بہتر یا افضل کوئی جماعت اس زمین کی پشت پر اور اس آسمان کے نیچے کبھی دیکھنے میں نہیں آئی' رَضِیَ اللّٰہُ تَعَالٰی عَنْہُمْ وَاَرْضَاہُمْ اَجْمَعِیْنَ!

(۲) اِتمام و اِکمالِ نبوت و رسالت کے مقاصد کی تکمیل کے اعتبار سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نسلِ آدم کے عظیم ترین انقلابی رہنما' ہمہ گیر ترین اسلامی تحریک کے قائد' پاکیزہ ترین معاشرے اور عمدہ ترین تہذیب و ثقافت کے مؤسّس' بہترین نظامِ حکومت کے بانی اور عدل و انصاف کے اعلیٰ ترین اصولوں پر مبنی نظامِ معیشت کے قائم کرنے والے ہیں —— اور ان تمام حیثیتوں سے آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم کے کمالات کا مظہر جامع وہ نظامِ حیات ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم نے نوعِ انسانی کو صرف نظری طور پر ہی عنایت نہیں فرمایا بلکہ اپنی بہترین عملی و انتظامی صلاحیتوں کو بروئے کار لا کر اسے ایک وسیع و عریض خطۂ ارضی پر بالفعل قائم فرما دیا اور اس طرح اس کا ایک کامل نمونہ عملاً پیش کر دیا تاکہ نوعِ انسانی پر ہمیشہ ہمیش کے لیے اللہ سبحانہٗ وتعالیٰ کی حُجّتِ بالغہ قائم ہو جائے اور محاسبۂ اُخروی کے موقع پر انسان یہ نہ کہہ سکیں کہ ہمیں اپنے اُلجھے ہوئے عمرانی عقدوں اور پیچ در پیچ سیاسی و معاشی مسائل کا کوئی متوازن اور

معتدل حل دیا ہی نہیں گیا۔

یہ بات بادنیٰ تأمل سمجھ میں آ سکتی ہے کہ اگرچہ آنحضور ﷺ کی بعثتِ مبارکہ کے مقدّم الذکر پہلو کے اعتبار سے بھی حکمتِ تامّہ کی بھی ضرورت تھی اور بصیرتِ کاملہ کی بھی، بالخصوص نفسیاتِ انسانی کا گہرا فہم تو اس کے ضمن میں لازمی و لابدی اہمیت کا حامل ہے، لیکن بعثتِ محمدی ﷺ کا مؤخّر الذکر پہلو تو ان سے بھی بڑھ کر اجتماعیاتِ انسانی کے ضمن میں گہری بصیرت اور اعلیٰ ترین انتظامی صلاحیتوں کا متقاضی تھا، جن کے بغیر اس میدان میں ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھایا جا سکتا، کجا یہ کہ کامیابی کے آخری مراحل سے ہم کنار ہوا جا سکے! اور واقعہ یہ ہے کہ سیرتِ محمدی ﷺ کا یہ پہلو اس درجہ روشن و تابناک ہے کہ اَغیار و اَعداء کو بھی اپنی تمام تر کور چشمی اور بد باطنی کے باوصف پوری آب و تاب کے ساتھ نظر آ تا رہا ہے! چنانچہ ایچ جی ویلز ہو یا سر ولیم میور، ٹائن بی ہو یا پروفیسر منٹگمری واٹ، سب نے آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبّر و معاملہ فہمی، دور اندیشی و پیش بینی اور حسنِ تدبیر و حسنِ انتظام کو بھرپور خراجِ تحسین ادا کیا ہے۔ اگرچہ یہ سعادت تو صرف دورِ حاضر کے ایک امریکی مصنف مائیکل ہارٹ کے حصے میں آنے والی تھی کہ وہ آنحضور ﷺ کی عظمت کے دونوں پہلوؤں کو مساوی طور پر خراجِ تحسین ادا کرتا، بایں طور کہ اُس نے اپنی تصنیف ''THE 100'' یعنی ''نسلِ انسانی کے سو عظیم ترین افراد'' میں آنحضور ﷺ کو سرفہرست رکھا ہے اس دلیل کے ساتھ کہ:

"He was the only man in history who was supermely successful on both the religious and secular levels."

یعنی آپ ﷺ دینی و روحانی اور دنیوی و سیاسی جملہ اعتبارات سے نسلِ انسانی کے کامیاب ترین فرد ہیں! واضح رہے کہ ان آراء کا تذکرہ صرف اس عربی مقولے کے پیشِ نظر کیا جا رہا ہے کہ ''الفضلُ مَا شهِدَتْ به الاعداءُ'' یعنی اصل فضیلت وہ ہے جس کی گواہی دشمن دیں، ورنہ ان لوگوں کے یہ اقوال نہ ہمارے لیے کسی بھی درجے میں سند ہیں، نہ آنحضور ﷺ کی عظمت کسی درجے میں ان کی محتاج ہے۔ الغرض آنحضور ﷺ کی بعثت مبارکہ کے مؤخر الذکر تکمیلی و اتمامی پہلو میں آپؐ کی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بتمام و کمال ہوا۔

مثل مشہور ہے ''ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات'' چنانچہ نبی اکرم ﷺ کی سیرت و

شخصیت میں بھی تنظیمی و انتظامی صلاحیتوں کا ظہور شروع ہی سے ہو گیا تھا۔ تجارت اور کاروبار کے ضمن میں ان کا اظہار جس شان و شوکت سے ہوا وہ تو اظہر من الشّمس ہے ہی، اس لیے کہ یہ اسی کی بنا پر ہوا کہ ایک جانب قوم نے آپ ﷺ کو ''الصّادق'' اور ''الامین'' کا خطاب دیا اور دوسری جانب آپؐ ہی کی طرح قوم سے ''الطاھرہ'' کے خطاب کی صورت میں اپنی پاک دامنی اور حسن اخلاق کا لوہا منوا لینے والی خاتون حضرت خدیجۃ الکُبریٰ رضی اللہ عنہا کی طرف سے پیغامِ نکاح موصول ہوا۔ تجارت کے علاوہ دوسرے قومی معاملات میں بھی قبل از آغازِ وحی آپ ﷺ کے حسنِ تدبیر اور حسنِ انتظام کی اعلیٰ صلاحیتوں کا ظہور وقتاً فوقتاً ہوتا رہا۔ مثلاً یہ کہ ''حِلف الفضول'' کے ذریعے آپ ﷺ نے قوم کے ایسے صالح نوجوانوں کو منظّم کرنے کی سعی فرمائی جو ظالم کا ہاتھ روکنے اور مظلوم کی مدد کرنے کے لیے جان و مال کی بازی لگانے کا حلف اٹھائیں اور کعبہ مشرفہ کی تعمیرِ نو کے دوران حجرِ اسود کو نصب کرنے کے موقع پر جس خون خرابے کا اندیشہ پیدا ہو گیا تھا وہ صرف آپ ﷺ کے حسنِ تدبّر و حسنِ انتظام کی بدولت ٹل سکا۔

آغازِ وحی کے بعد سے ہجرت تک کے زمانے میں اگرچہ مجموعی طور پر آپ ﷺ کی سیرتِ مطہرہ کے بعض دوسرے پہلو جو دعوت و تبلیغ اور تزکیہ و تربیت سے زیادہ مناسبت رکھتے تھے زیادہ نمایاں رہے، تاہم اس دوران میں بھی ایک جانب تو حسن انتظام کا ظہور دعوت و تبلیغ کے لیے اختیار کیے جانے والے طریقوں اور ذریعوں کے ضمن میں ہوتا رہا، جیسے ﴿وَاَنْذِرْ عَشِيْرَتَكَ الْاَقْرَبِيْنَ ﴿٢١٤﴾﴾ (الشعراء) ''خبردار کیجیے اپنے قریبی عزیزوں کو'' کے حکم ربانی پر عمل کے سلسلے میں دو بار دعوتِ طعام کا اہتمام اور ﴿فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ﴾ (الحجر: ۹۴) ''اب ڈنکے کی چوٹ کہیے جس کا حکم آپ کو دیا گیا ہے!'' کے حکم خداوندی کے ضمن میں قوم کو جمع کرنے کے لیے عمدہ ترین انتظامی تدبیر یعنی کوہِ صفا پر چڑھ کر ''واصباحاہ'' کا نعرہ لگانا! وَقِسْ عَلٰی ذٰلِک --- اور دوسری طرف اسی دعوتی و تبلیغی سرگرمی کے بالکل متوازی اور پہلو بہ پہلو آپ ﷺ کی تنظیمی استعداد بھی بھرپور طور پر مسلسل بروئے کار رہی، جس کے نتیجے میں آپؐ نے دعوت و تبلیغ کے ذریعے جو انسانی مواد

(human material) جمع کیا اُس نے بدھ مت کے بھکشوؤں کے مانند فقیروں اور درویشوں کے ایک اَنبوہ کے بجائے ''اِعلاءِ کلمۃ اللہ'' اور ''اظہارِ دینِ حق'' کے لیے جان لڑا دینے والوں کی ایک ایسی منظّم جماعت کی صورت اختیار کی جس نے مدنی دور میں ﴿اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝﴾ (الصف) ''اللہ تو محبّت کرتا ہے اُن سے جو اُس کی راہ میں جنگ کریں ایسی صفیں باندھ کر گویا وہ ایک سیسہ پلائی ہوئی دیوار ہوں!'' کی عملی تفسیر بن کر دکھا دیا۔ یہ تنظیم ظاہر ہے کہ کسی ایسے ناظم یا منتظم کے بغیر ممکن نہیں ہے جس میں تنظیمی و انتظامی صلاحیتیں درجۂ کمال کو پہنچی ہوئی ہوں ـــــ اور یہ ناظم اور منتظم ظاہر ہے کہ آنحضور ﷺ ہی تھے!

حیاتِ طیّبہ کے مکّی دور کے وسط میں تعذیب و تشدد (persecution) کے شدّت اختیار کرنے پر اہلِ ایمان کو ارضِ حبشہ کی طرف ہجرت کر جانے کی اجازت بھی آپ ﷺ کے حسنِ انتظام کا شاہکار ہے۔ اور پھر ہجرتِ مدینہ منورہ کے موقع پر بھی اس عظیم نقل مکانی کو اس طور سے منظّم کرنا کہ جماعت المسلمین کے اکثر افراد کو اپنے سامنے مدینہ روانہ فرمانے کے بعد آپ ﷺ نے آخر میں رختِ سفر باندھا' جس کے نتیجے میں سفرِ ہجرت نے ایک منظّم نقل و حرکت کی صورت اختیار کر لی نہ کہ کسی بھگدڑ یا فرار کی --- یہ پوری صورت حال بھی بلاشبہ ایک عظیم تنظیمی و انتظامی استعداد کی مظہرِ اَتم ہے!

رہا مدنی دور تو اس کے بارے میں کچھ عرض کرنا بلاشبہ سورج کو چراغ دکھانے کے مترادف ہے' اس لیے کہ ان دس سالوں کے دوران آنحضور ﷺ کے حسنِ تدبّر و معاملہ فہمی' دور اندیشی و پیش بینی' ترتیب و تنظیم اور انتظام و انصرام کے ایک دو نہیں سینکڑوں اور ہزاروں مظاہر سامنے آتے ہیں' جن پر مؤرخین اور محققین کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ جاتی ہیں' بڑے سے بڑے مدبر و سیاستدان دنگ رہ جاتے ہیں اور اعلیٰ سے اعلیٰ ناظم اور منتظم حیران و ششدر رہ جاتے ہیں کہ ایک فردِ واحد میں اتنے محاسن و کمالات کا اجتماع' ہر جہت اور ہر پہلو سے حسنِ تدبیر و تدبّر اور حسنِ تنظیم و انتظام کا مظہرِ اَتم! پھر لطف یہ کہ حیاتِ انسانی کے کسی ایک ایسے گوشے کا تعین ممکن ہی نہیں جس کے بارے میں یہ کہا جا سکے کہ اس میں

آنحضور ﷺ کے حسن انتظام کا ظہور دوسرے گوشوں سے زیادہ ہوا ہے۔ گویا بات صدفی صدو ہی ہے کہ ؎

زفرق تا بہ قدم ہر کجا کہ می نگرم کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا ایں جاست!

مسلمانوں کا جو اجتماعی نظام نبی اکرم ﷺ نے قائم فرمایا اور اس میں نظم و تنظیم کو جو اہمیت آپؐ نے دی' اس کا سب سے بڑا مظہر یہ ہے کہ آپؐ نے عبادات کے نظام کو بھی ایک اجتماعی نظم کے ساتھ وابستہ کر دیا۔ یہاں تک کہ نماز کے بارے میں شدید تاکید فرما دی کہ اسے باجماعت ادا کیا جائے' خواہ سفر ہو خواہ حضر اسے کسی صورت ترک نہ کیا جائے۔ چنانچہ امام ابوداؤدؒ نے ایک روایت تو حضرت ابوسعید خدری رضی اللہ عنہ سے یہ نقل فرمائی کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((اِذَا كَانَ ثَلَاثَةٌ فِيْ سَفَرٍ فَلْيُؤَمِّرُوْا اَحَدَهُمْ))

''جب سفر میں تین آدمی ہوں تو ان میں سے ایک کو لازماً امیر بنا لیا جائے۔''

اور دوسری روایت حضرت ابوالدرداء رضی اللہ عنہ سے نقل فرمائی کہ آنحضور ﷺ نے فرمایا:

((مَا مِنْ ثَلَاثَةٍ فِيْ قَرْيَةٍ اَوْ بَدْوٍ وَلَا تُقَامُ فِيْهِمُ الصَّلَاةُ اِلَّا وَقَدِ اسْتَحْوَذَ عَلَيْهِمُ الشَّيْطَانُ' فَعَلَيْكَ بِالْجَمَاعَةِ' فَاِنَّمَا يَاْكُلُ الذِّئْبُ الْقَاصِيَةَ))

''اگر کسی بستی یا جنگل میں تین آدمی ہوں اور پھر وہ نماز باجماعت کا نظام قائم نہ کریں تو ان پر شیطان لازماً مسلط ہو کر رہے گا۔ سنو! جماعت سے وابستہ رہو' اس لیے کہ بھیڑیا ریوڑ سے علیحدہ رہنے والی بھیڑ کو ضرور ہڑپ کر جاتا ہے!''

پھر اس نماز باجماعت میں آنحضور ﷺ کا ذوقِ ترتیب و تنظیم اسے برداشت نہ کر سکتا تھا کہ صف ٹیڑھی ہو' اس لیے کہ صفوں کی کجی بھی جذبِ اندروں کے فقدان کی غمازی کرتی ہے' لہٰذا تکبیر تحریمہ سے قبل آپ ﷺ کی نوائے شیریں بلاناغہ بلند ہوتی تھی:

((سَوُّوْا صُفُوْفَكُمْ فَاِنَّ تَسْوِيَةَ الصُّفُوْفِ مِنْ اِقَامَةِ الصَّلَاةِ)) (متفق علیہ)

''اپنی صفوں کو سیدھا کرو' اس لیے کہ صفوں کو سیدھا کرنا بھی اقامت صلوٰۃ کے آداب میں سے ہے!!''

مسلمانوں کی حیاتِ ملّی کے اس اساسی اور بنیادی شعبے یعنی عبادات میں' جس میں بالعموم اجتماعیت پر انفرادیت مقدّم رہتی ہے' نبی اکرم ﷺ نے نظم و تنظیم کو اس درجہ اہمیت دی

ہے، تو اس پر قیاس کیا جاسکتا ہے کہ حیاتِ اجتماعی کے دوسرے شعبوں میں انتظام و انصرام کا عالم کیا ہوگا! ع ''قیاس کن زگلستانِ من بہارِ مرا!''

مدینہ منورہ کی چھوٹی سی شہری اسلامی ریاست کا چارج سنبھالنے کے فوراً بعد معاشرے کی تنظیم نو اور دفاعی انتظامات کا جو اہتمام رسول اللہ ﷺ نے فرمایا وہ ملّی وملکی سطح پر حکومت و ریاست کے معاملات کے ضمن میں آپؐ کے حسنِ انتظام کی نہایت اعلیٰ مثال ہے۔ چنانچہ ایک جانب آپ ﷺ نے یہود سے معاہدے کرکے مدینہ کے دفاع کا انتظام فرمایا اور دوسری جانب مہاجرین اور انصار میں مؤاخات یعنی بھائی چارے کے ذریعے معاشرے کی تنظیم نو کا اہتمام کیا۔ اور یہ بات بادنیٰ تامل سمجھ میں آسکتی ہے کہ ان دونوں معاملات میں ادنیٰ سی چوک یا ذرا سی تاخیر بھی آئندہ حالات و واقعات کے رخ کو بالکل بدل کر رکھ سکتی تھی۔ اور کسی بھی مدبّر یا منتظم کے لیے وقت کے تقاضوں کو بروقت سمجھ کر ان کے لیے مناسب انتظام کرلینے ہی میں کامیابی کا راز مضمر ہوتا ہے!

مدنی دور کے ابتدائی آٹھ سال کے اکثر و بیشتر حصّے کے دوران مسلّح تصادم کا سلسلہ جاری رہا۔ اس کے ضمن میں بھی جہاں آنحضور ﷺ کی دُور اندیشی اور معاملہ فہمی کے شاہکار مسلسل سامنے آتے ہیں اور آپؐ کی حکمتِ حربی، مہارتِ جنگ اور سپہ سالارانہ صلاحیتوں کا اظہار ایسے پُرشکوہ انداز میں ہوتا ہے کہ دوست دشمن سب مرحبا کہنے پر مجبور ہوجاتے ہیں، وہاں فوجوں کی ترتیب و تنظیم، رسد کا اہتمام و انصرام، چھاپہ مار دستوں کی بر موقع ترسیل اور دشمن کی ہر ممکن چال کو ناکام بنانے کے لیے پیش بندی کے ضمن میں آپ ﷺ کی انتظامی صلاحیتوں کا ظہور بھی بتمام و کمال ہوتا رہا۔ تاآنکہ ۸ھ میں فتح مکّہ اور معرکۂ حنین کے بعد جب اللہ تعالیٰ نے آنحضور ﷺ کو عرب پر فیصلہ کُن غلبہ عطا فرمادیا اور اَطراف و اَکنافِ عرب سے تمام قبائل کے وفود نے مدینہ منورہ حاضر ہوکر اطاعت قبول کرلی، گویا ﴿وَرَاَیۡتَ النَّاسَ یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا ﴿۲﴾﴾ (النصر) کا سماں بندھ گیا تب آپؐ کی انتظامی صلاحیتیں پورے طور پر بروئے کار آئیں اور پورے جزیرہ نمائے عرب میں وہ نظام قائم ہوا جس کی داغ بیل تو آنحضور ﷺ نے بنفسِ نفیس اپنی حیاتِ

دُنیوی کے آخری دو سال کے دوران ڈال دی تھی، لیکن جس پر نظامِ اسلامی کا قصرِ عظیم اپنی پوری شان و شوکت کے ساتھ دورانِ خلافتِ راشدہ تعمیر ہوا۔

اس انتظام و انصرام مملکت اسلامی کے ضمن میں وُلاۃ و عُمّال کا تقرر بھی شامل تھا، ائمہ ومؤذّنین کی تقرری بھی شامل تھی، محصّلینِ زکوٰۃ و جزیہ کی نامزدگی بھی تھی، جنگوں کا انسداد بھی تھا، غیر قوموں سے گفت و شنید اور صلح و مصالحت کے معاملات بھی تھے، انسدادِ جرائم اور اقامتِ حدود و اجرائے تعزیرات کا نظام بھی تھا۔ حُکّام و عُمّال اور محصّلینِ زکوٰۃ و فدیہ کی خبر گیری اور احتساب کا سلسلہ بھی تھا اور ان سب کے ساتھ ساتھ تھا قیامِ حکومتِ اسلامی کا اصل اور اوّلین مقصد یعنی تبلیغ و دعوتِ دین، تربیت و اصلاحِ عوام اور تعلیم و تلقینِ شریعت!! اور یہ سب کچھ تو تھا اندرونِ ملکِ عرب، اس پر مستزاد تھیں آنحضور ﷺ کی بعثتِ عمومی ﴿کَآفَّۃً لِّلنَّاسِ بَشِیۡرًا وَّ نَذِیۡرًا﴾ (سبا:۲۸) کی ذمہ داریوں کے ذیل میں آپؐ کی مصروفیات، یعنی تحریر دعوت نامہ ہائے مبارک اور ترسیل وفود۔ اور چونکہ ان کے ضمن میں آغاز ہوگیا سلطنت روما کے ساتھ عسکری تصادم کا، لہٰذا ترتیب و تنظیم جیوش، جس کے ضمن میں اوّلاً پیش آیا غزوۂ مُوتہ، ثانیاً سفر تبوک اور ثالثاً تیّار ہوا جیشِ اُسامہ، جو روانگی کے لیے تیّار ہی تھا کہ آنحضور ﷺ نے اس جہانِ فانی سے کوچ کیا اور رفیقِ اعلیٰ کی جانب مراجعت اختیار فرمالی۔ فصلَّى الله عليه وسلَّم تسليمًا كثيرًا كثيرًا وفداه آباؤنا وأمّهاتنا!

عقلیں دنگ ہیں کہ آنحضور ﷺ نے اپنی حیاتِ دُنیوی کے آخری دو سال کتنی متنوع اور گوناگوں مصروفیات میں بسر کیے اور پھر یہ کہ آج تک کوئی نہیں کہہ سکا کہ فلاں معاملے میں انتظامی اعتبار سے آنحضور ﷺ سے کسی غلطی کا صدور ہوگیا تھا۔ ﴿فَارۡجِعِ الۡبَصَرَ ۙ ہَلۡ تَرٰی مِنۡ فُطُوۡرٍ ﴿۳﴾ ثُمَّ ارۡجِعِ الۡبَصَرَ کَرَّتَیۡنِ یَنۡقَلِبۡ اِلَیۡکَ الۡبَصَرُ خَاسِئًا وَّ ہُوَ حَسِیۡرٌ ﴿۴﴾﴾ (الملک) ''ذرا نظر دوڑاؤ تو، کوئی خامی نظر آتی ہے؟ پھر بار بار اچھی طرح دیکھو، تمہاری نگاہ تھک ہار کر واپس آجائے گی اور کسی پہلو سے کسی غلطی کی نشاندہی تم نہ کرسکو گے!''

وآخر دعوانا ان الحمد لله ربِّ الْعَالَمِين OO

دامنِ مصطفی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستگی:
تمام مسائل کا واحد حل

موجودہ حالات کے تناظر میں ایک فکر انگیز تحریر

مولانا ڈاکٹر محمد جہان یعقوب*

اُمّتِ مُسلمہ سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے وابستگی کے لمبے چوڑے دعوے تو کرتی ہے‘ لیکن اس کی عملی زندگی سیرتِ رسولؐ سے بہت دُور ہے۔ بالفاظِ دیگر ہم سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے اعتقادی وابستگی تو رکھتے ہیں‘ لیکن عملی وابستگی نہیں۔ سیرت سے اعتقادی وابستگی کا مطلب یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو اللہ تعالیٰ کا برحق رسول تسلیم کیا جائے اور آپؐ کی تعلیمات کو پاکیزہ تعلیمات مانا جائے‘ یہ صرف اعتقادی وابستگی ہے۔ الحمدللہ! ہر مسلمان سیرت سے اعتقادی وابستگی رکھتا ہے‘ لیکن یہ کافی نہیں‘ بلکہ سیرت سے عملی وابستگی مطلوب ہے۔ سیرت کے ساتھ عملی وابستگی یہ ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی سُنّت و سیرت اور آپؐ کے طور طریق کو عملی زندگی میں نافذ کیا جائے۔ اس حوالے سے مسلم اُمّہ کافی کوتاہی کا شکار ہے۔ مسلمان نماز کی حالت میں تو سیرتِ رسولؐ کے پابند ہوتے ہیں‘ لیکن زندگی کے دیگر شعبوں میں وہ خود کو سیرت سے آزاد سمجھتے ہیں۔ ایک مسلمان نماز ویسے ہی ادا کرتا ہے جیسے رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ادا کی تھی‘ لیکن اس کی تجارت اور معاشرت ویسی نہیں ہوتی جیسی رسول اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تھی۔

جھوٹ‘ چوری‘ وعدہ خلافی‘ بغض‘ کینہ‘ فخر و غرور‘ ریا و دکھلاوا‘ غداری و دھوکا دہی‘ بدگوئی‘ فحش گوئی‘ بدگمانی‘ حرص‘ حسد‘ چغلی‘ غرض یہ کہ ساری اخلاقی برائیاں عام مسلمانوں میں ہی نفوذ پذیر نہیں ہیں‘ بلکہ خواص میں بھی اخلاقیات کا انحطاط پایا جاتا ہے۔ اِس انحطاط و تنزّل کا صرف اور صرف ایک ہی علاج ہے کہ ہر بُری خصلت کی برائی و شناعت اور اس کے دنیوی

* انچارج شعبہ تفسیر‘ دارالتصنیف‘ جامعہ بنوریہ‘ کراچی

واخروی نقصانات کو معقول انداز میں بیان کیا جائے۔ تاکہ معقولیت پسند طبقہ شریعت سے قریب ہو۔ اس کے ساتھ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ فاضلہ کو بھی بیان کیا جائے اور ان کو اختیار کرنے کی تلقین کی جائے۔ اس کے لیے ضرورت ہے کہ قرآن حکیم کو ترجمہ کے ساتھ پڑھنے اور اس کی تفسیر کو عام کیا جائے‘ ساتھ ہی احادیث کی تعلیم کا بھی اہتمام ہو‘ غیروں کے بجائے اپنی خرابیوں پر غور کیا جائے اور اصلاح کی کوشش کی جائے‘ نیز تذکیر و موعظت اور تبلیغ و دعوت کا اہتمام کیا جائے۔ دنیا کو بتایا جائے کہ خاتم النّبیّین صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بعثت کا اصل مقصد دنیا میں عدل و اعتدال پر مبنی نظامِ حیات کا قیام تھا۔ اِس کے لیے آپؐ کی دعوت میں درج ذیل امور کا اہتمام تھا:

غیروں کی اصلاح سے پہلے اپنی ذات کی اصلاح‘ اللہ ربّ العزت کے سارے احکام سے لوگوں کو روشناس کرانا‘ اللہ تعالیٰ کے سارے احکام کو زمین پر نافذ کرنے کی کوششیں اور تدبیریں کرنا‘ ہر ایک کے حقوق و فرائض کو واضح کرنا‘ کمزور طبقات مثلاً عورتوں‘ بچوں‘ غلاموں‘ خادموں اور جانوروں کے حقوق کو متعین فرما کر ان کی ادائی کی تلقین‘ معاشرہ میں پیدا ہونے والی خرابیوں پر گرفت‘ احکامِ الٰہی کی تعمیل کی تلقین کا مزاج بنانا‘ آیات و احادیث کی تعلیم کے ساتھ ان پر عمل کرنے اور خود احتسابی کی تعلیم‘ آیات کی تفسیر اور احادیث کے یاد کرنے اور ان کے مذاکرے کا ماحول‘ اخلاقِ رذیلہ کی خرابیوں کو بیان کر کے ان سے بچنے اور اخلاقِ فاضلہ کو اختیار کرنے کی تلقین‘ ایسا ماحول بنانا کہ ہر شخص دعوتِ اصلاح و تبلیغ کو اپنی ذِمّہ داری سمجھنے لگے۔

اس سبق کو دہرایا جائے کہ ایک مسلمان کو اپنے اخلاق و کردار میں کیسا ہونا چاہیے؟ درس گاہِ نبوت کے تربیت یافتہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کیسے تھے؟ ان کے اندر اخلاص و تقویٰ‘ شرم و حیا اور صبر و شکر کی صفات تھیں۔ وہ دیانت دار‘ امانت دار اور سخاوت و شرافت کے خوگر تھے۔ ان کے اندر ایثار و قربانی‘ عفت و پاک دامنی اور تواضع و انکساری کی اعلیٰ صفات پائی جاتی تھیں۔ وہ خوش کلام‘ خوش الحان‘ خوش دِل اور رحم و کرم کے پیکر تھے‘ وہ ہمیشہ موت کو یاد رکھتے تھے‘ ان کے معاملات کی صفائی سے لوگ متاثر تھے۔ یہ ساری چیزیں آیات و احادیث کی روشنی میں بیان کی جائیں‘ اس سے اپنوں کی اصلاح ہوگی اور اغیار بھی مستفید ہوں گے۔ آخر کیا وجہ ہے کہ ان مسلمانوں کو دیکھ کر‘ ان کے بلند و بالا اخلاق سے متاثر ہو کر لوگ اِسلام قبول کرتے تھے‘ آج کوئی غیر مسلم کسی مسلمان کو دیکھ کر اسلام کو نہیں سمجھ سکتا‘ بلکہ اسلام اور اِسلام کی اخلاقی تعلیمات کو سمجھنے کے لیے

کتب خانوں کا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس کی وجہ یہی ہے کہ ہم اخلاقِ نبوی و کردارِ صحابہ پر نہ خود چلتے ہیں اور نہ اس کی درست تعبیر و تشریح اقوامِ عالَم کے سامنے رکھنے کی کوشش کرتے ہیں۔ اِس سلسلے میں قرآن و حدیث کے نصوص واضح کیے جائیں تو کوئی وجہ نہیں کہ اس سے ایک ایسا صالح معاشرہ وجود میں نہ آئے جو صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اور خیر القرون کے معاشرے کی طرح ہو اور ان مبارک اَدوار کی خوبیاں جو تاریخ کے صفحات کی زینت بنی ہوئی ہیں، ہماری عملی زندگی میں نہ آجائیں۔

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور اُسوۂ حسنہ کو پوری طرح اپنی زندگی میں رائج کرنے کے لیے اجتماعی حیثیت سے اُمّت کو کچھ عملی اقدامات کرنے ہوں گے اور اتباعِ سُنّت اور اُسوۂ حسنہ کو اُمّتِ مُسلمہ میں عام کرنے کے لیے تعارفِ سیرت کی طرح باقاعدہ مہم چلانی ہوگی۔ مختلف اداروں اور تحریکوں کے ذریعے نبوی سنتوں کی عملی مشق کرانی ہوگی۔ گھروں میں والدین اور سرپرست حضرات کو موقع محل کے اعتبار سے بچوں کو سنتوں کی عملی تربیت دینی ہوگی۔ کھانے کا موقع ہو تو کھانے کی سنتیں، سوتے وقت سونے کی سنتیں اور لباس پہننے کا موقع آئے تو اس کی سنتیں یاد دلائی جائیں، علیٰ ھٰذا القیاس۔ ائمہ مساجد یومیہ چند سنتوں کی جانب توجّہ دلائیں اور ان پر عمل کی ترغیب دیں۔ روزمرہ کی زندگی سے متعلق سنتوں کے مستند مجموعے مسلم گھرانوں میں عام کیے جائیں۔

سیرتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے متعلق ایک ذِمّہ داری سیرت کے دفاع کی ہے۔ تاریخ کا شغف رکھنے والے جانتے ہیں کہ صلیبی جنگوں کے خاتمے پر عیسائیوں کے ایک رہبر سینٹ لوئس نے جو لائحۂ عمل مرتب کر کے دیا تھا اس میں ایک نکتہ یہ بھی تھا کہ مسلمانوں کے درمیان سے اپنے ہم خیال لوگ تلاش کرو، ایسے لوگ تمھیں اشرافیہ یعنی ایلیٹ کلاس اور حکمرانوں کے طبقے سے بآسانی ملیں گے۔ سو اِن خطوط پر محنت شروع کی گئی۔ 'اسلامی اسکالرز' کے نام سے ایسے آزاد خیال لوگ تیار اور تلاش کیے گئے۔ جن کی نظر میں شریعت گویا موم کی گڑیا تھی۔ مکالمہ اور ڈبیٹ کا دائرہ اس قدر وسیع کر دیا گیا کہ شعائرِ اسلام اور مسلّماتِ دین بھی اس کی زد میں آگئے، مکالمے کے نشتر اصولِ دین پر بھی بے دردی سے چلائے گئے۔ ذاتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم اور باتِ نبی صلی اللہ علیہ وسلم میں فرق کرنے کی کوشش کی گئی۔ سُنّت کی من مانی تشریحات کی گئیں۔ اِن سب کوششوں کا مقصود علّامہ اقبال کے الفاظ میں سوائے اِس کے کچھ نہ تھا کہ ع ''روحِ محمد صلی اللہ علیہ وسلم اس کے بدن سے نکال دو!'' — لیکن کفر کو ایک بار پھر سخت ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا۔

بدقسمتی سے خود مسلمانوں میں ایک طبقہ ایسا پیدا ہو چکا ہے جو سیرت و سُنّت کا شدّت سے منکر ہے۔ بدقسمتی سے اس طرح کی ذہنیت کے حامل لوگوں میں روز بروز اضافہ ہوتا جا رہا ہے اور منکرینِ حدیث میدان میں پوری طرح سرگرم ہو چکے ہیں۔ سیرت و سُنّت سے متعلق ان حضرات کے شبہات کا دور کرنا علمائے اُمّت کی اہم ذِمّہ داری ہے اور یہ کام منظم طور پر انجام دیا جانا چاہیے۔ ایسے علماء تیار کیے جائیں جو منکرینِ حدیث کے ہر شبہ کا جواب دے سکتے ہوں۔ عوام کو اس فتنے سے خبردار کرنے کے لیے علماء و خطباء حضرات اپنے خطبوں اور بیانات و تقاریر میں خصوصیت کے ساتھ اس موضوع کو زیرِ بحث لائیں۔

سیرت سے وابستگی کے نتیجہ میں عائد ہونے والی ایک اہم ذِمّہ داری تحفظ ختم نبوت کی ہے۔ بہت سے سادہ لوح مسلمان قادیانیت کا شکار ہو رہے ہیں، کیونکہ عام مسلمانوں کے ذہنوں میں ختمِ نبوّت کا تصوّر واضح نہیں۔ اضلاع اور دیہاتوں میں قادیانیت سرگرم ہے، شہروں میں بھی کافی سرگرمیاں جاری ہیں۔ سیرت النبی صلی اللہ علیہ وسلم کے جلسوں میں ختم نبوت کے موضوع پر تفصیلی روشنی ڈالی جائے۔ علاوہ ازیں مختلف تحریکات کے ذِمّہ دار حضرات قادیانیت سے متاثرہ مقامات کا دورہ کر کے مسلمانوں کے عقیدۂ ختم نبوت کا تحفظ کریں۔ قادیانیت کا فتنہ جس تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے اُمّتِ مُسلمہ میں اسی قدر غفلت پائی جاتی ہے۔ سیرتِ رسولؐ سے وابستگی کا تقاضا ہے کہ ہم ختمِ نبوت کے تحفظ کے لیے ہر چیز کی قربانی کے لیے تیار ہو جائیں۔

صلیبی جنگوں میں دو سو سال مسلمانوں کے خلاف نبرد آزما رہنے اور سلطان صلاح الدین ایوبیؒ و نورالدین زنگیؒ جیسے شیر دل مسلم سپہ سالاروں سے شکست فاش کے بعد عیسائی شہ دماغوں نے مسلمانوں کے ناقابلِ تسخیر ہونے کی وجوہات پر غور کیا تو یہ بات سامنے آئی کہ ان کے دلوں میں حُبِّ رسالت کی جو شمع فروزاں ہے وہی ان کا اصل اثاثہ ہے، ورنہ مادّی و مالی وسائل اور افرادی و فوجی طاقت میں مسلمانوں کا ہم سے کوئی مقابلہ نہیں۔ چنانچہ اب مسلمانوں کے دل سے اس شمع فروزاں کو گل کرنے کی تدبیریں شروع ہوئیں۔ تحریک استشراق و مستشرقین کا یہی ہدف تھا، بعد میں مشنریز کی محنت کا بنیادی نکتہ بھی یہی قرار پایا۔ شانِ رسالت میں گستاخیوں کا سلسلہ شروع ہوا، مگر مسلمانوں نے گستاخوں کی گردنیں ناپنے اور انھیں واصلِ جہنم کرنے میں کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا۔ ابلیسِ لعین کبھی کھل کر اور کبھی چھپ کر اپنا کام کرتا رہا، اس کے بچھائے

ہوئے شکوک وشبہات کے جال محض تارِ عنکبوت ثابت ہوئے‘ اس کی تمام محنت پرِکاہ و پارۂ سنگ کی طرح بے اثر و بے ثمر رہی‘ مگر اُس نے ہار نہیں مانی‘ کیوں کہ اس کو اس بات کا بخوبی ادراک تھا کہ ع ’’دردِ دلِ مسلم مقامِ مصطفیٰ ﷺ است‘‘ —— لہٰذا اُس نے اپنے سیاسی فرزندوں کو ہدایت جاری کی کہ ؎

وہ فاقہ کش کہ موت سے ڈرتا نہیں ذرا
روحِ محمد ﷺ اُس کے بدن سے نکال دو!
فکرِ عرب کو دے کے فرنگی تخیلات
اسلام کو حجاز و یمن سے نکال دو!

اسلام کے خلاف ایک پروپیگنڈا اشدومد کے ساتھ کفریہ طاقتوں نے ہمیشہ یہ کیا کہ مسلمان دہشت گرد ہیں اور یہ اپنے علاوہ کسی دین ومذہب کے پیروکاروں کو انسانی حقوق تک دینے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اسلام عدم برداشت کا سبق دیتا ہے اور اسلام کو تلوار کے زور پر پھیلایا گیا۔ اگر ایک طرف منصف مزاج غیر مسلم دانش وروں نے اسلام اور پیغمبر آخرالزماں ﷺ کی عظمت کا اپنے مقالات ومضامین‘ تقاریر وخطبات اور کتب وجرائد میں برملا اعتراف کیا تو دوسری طرف انتہاپسند غیر مسلم ’اسکالرز‘ کی بھی کمی نہیں رہی۔ چاند کی طرف منہ کر کے تھوکنے والے ہر طبقے میں پائے جاتے ہیں‘ اگرچہ یہ تھوک خود ان کے منہ پر پڑتے ہیں‘ لیکن اپنے سفلی وابلیسی جذبات کی تکمیل کے لیے وہ اس سے باز نہیں آتے۔ سورج کو اپنی پھونکوں سے بجھانے کی کوشش کرنے والوں کو اس بات کی کوئی پروا نہیں ہوتی کہ ہم اس حرکت کی وجہ سے لوگوں کے سامنے تماشا بن جائیں گے‘ لیکن سورج کی تابناکی میں ذرّہ برابر کمی نہیں آئے گی۔ ان عناصر کی اس نوع کی کوششوں کے بنیادی طور پر دو مقصد ہوتے ہیں۔ ایک اپنے ابلیسی جذبات کی تسکین اور دوسرا مسلمانوں کو طیش دلانا‘ تاکہ ردِّعمل میں وہ بھی ایسی کوئی حرکت کریں‘ جس کی وجہ سے اُن کے لیے یہ پروپیگنڈا کرنا آسان ہوجائے کہ مسلمان عدم برداشت کا شکار اور دہشت گرد وانتہاپسند ہیں۔

خاتم المرسلین نبی الثقلین امام الانبیاء سرکارِ دوجہاں محمد رسول اللہ ﷺ کے خاکے بنانا اور انھیں شائع کرنا بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ مختلف ممالک اس قسم کی حماقت کر چکے ہیں‘ اب فرانس نے یہ حرکت کی ہے اور اپنی حماقت پر اسے تادمِ تحریر کسی قسم کی ندامت بھی نہیں

ہے۔ اللہ تعالیٰ کی سُنّت ہے کہ وہ اپنے منکر وگستاخ کی تو رسّی دراز کرتا ہے‘ لیکن اپنے حبیب ﷺ کے منکر وگستاخ سے نقد حساب لیتا ہے۔ تاریخِ اسلام ایسے واقعات سے بھری پڑی ہے‘ جن کے مطالعے سے ہمارے اس دعوے کی تصدیق ہوتی ہے۔ شاہ ایران کسریٰ پرویز کا انجام جریدۂ عالَم کے اوراق پر ثبت ہے‘ جس نے حبیبِ خدا ﷺ کا نامۂ مبارک چاک کیا تو اللہ تعالیٰ نے اُسے تاج وتخت سے محروم کر کے وہ سانسیں بھی چھین لیں جو بلامبالغہ باعث تخلیقِ کائنات ﷺ کا صدقہ ہیں۔ کاش! اِن بدباطن کفار کو اس بات کا اِدراک ہوتا‘ کہ اِس عالم کو وجود ہی اللہ تعالیٰ نے اپنے حبیبِ پاک ﷺ کی وجہ سے عطا فرمایا ہے۔ ان کے یہ ہاتھ‘ ان کی چلتی سانسیں‘ ان کے حواس اور ان کا اقتدار واختیار بلکہ ان کا اپنا وجود بھی نبی الثقلین ﷺ کا صدقہ ہے۔ جس کی وجہ سے وجود ملا‘ جس کی وجہ سے زندگی ملی‘ جس کی وجہ سے سانسوں کی آمدورفت قائم ہے‘ جس کے صدقے سے اقتدار واختیار ملا‘ اُس عظیم المرتبت ہستی کی شانِ اَقدس میں گستاخی سے بڑھ کر اور نمک حرامی کیا ہوسکتی ہے!

فرانس قہرِالٰہی کے نشانے پر آچکا ہے۔ میکرون کو اب اپنے اقتدار کے دن شمار کرنے چاہئیں اور اس لمحے کا انتظار کرنا چاہیے جب وہ رہتی دنیا تک کے لیے نشانِ عبرت بنے۔ جو ممالک اس کی تائید کر رہے ہیں‘ وہ بھی اس کے ساتھ اِس جرم میں برابر کے شریک ہیں۔ ایک طرف اکثر مسلم حکمرانوں کی پراسرار ’خاموشی‘ باعث افسوس ہے‘ تو دوسری طرف پاکستان سمیت مسلم ممالک کے حکمرانوں کا کمزور ردِّعمل بھی باعثِ تاسف ہے۔ کاش! یہ لوگ اپنے مفادات کے بجائے رحمۃٌ للعالمین ﷺ کی ذاتِ بابرکات کو مقدّم رکھتے۔

گستاخانہ خاکوں کی اشاعت کے لیے کفریہ طاقتوں نے اِس بار فرانس کا انتخاب کیا۔ یہ ’ٹیسٹ کیس‘ تھا‘ تاکہ دیکھیں! مسلمانوں کی اپنے نبی ﷺ سے وابستگی اور عشق ومحبت کا تعلق اُسی طرح قائم ہے جس طرح اِن کے آباء واَجداد کا طُرّۂ امتیاز تھا‘ یا ہماری ’نظریاتی محاذوں‘ پر قلبِ مسلم سے عشقِ محمد ﷺ کو نکالنے کی کوششیں کچھ اثر دِکھانے میں کامیاب ہوگئی ہیں؟ سوشل بائیکاٹ نے فرانس اور اُس کے ہم نواؤں کی چیخیں نکال دی ہیں۔ اس سلسلے کو مزید مربوط‘ مضبوط اور وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اِن شاءاللہ! ہمارا یہ عمل نہ صرف عاشقانِ رسول ﷺ کی فہرست میں ہمارا نام لکھوائے گا‘ بلکہ کفر بھی ناک رگڑ کر اپنا تھوکا خود چاٹنے پر مجبور ہوجائے گا۔

دعوتِ دین کے لیے غیر مسلموں میں سیرتِ رسول ﷺ کو مؤثر ذریعے کے طور پر استعمال کیا جاسکتا ہے۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلویؒ فرماتے ہیں: ''غیر مسلم طبقہ پر اتمامِ حُجّت کے دو طریقے ہیں: ایک طریقہ یہ ہے کہ ہم مسلمان اپنی عملی زندگی کو اسلام کی صداقت کا عملی نمونہ بنا کر پیش کریں اور ہماری عملی زندگی میں لوگ اسلام کی برکتیں اور رحمتیں دیکھ کر اسلام کو نجات وہدایت کا راستہ تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں' دوسرا طریقہ یہ ہے کہ رحمتِ عالَم ﷺ کے اخلاقی کمالات اور آپ کے معجزانہ کریکٹر کو لوگوں کے سامنے پیش کیا جائے اور ہر طبقہ کو اس کی زبان' اس کی سمجھ اور اس کی استعداد کے مطابق سمجھانے کی کوشش کی جائے تاکہ رحمۃٌ للعالمین اور صاحبِ خلقِ عظیم رسول ﷺ کی محبّت لوگوں کے دلوں میں اُتر جائے اور پھر اس محسنِ انسانیت کی زبان سے نکلی ہوئی ہر بات کو لوگ سچی ماننے پر اپنے آپ کو مجبور پانے لگیں۔''

اس کے لیے مختلف طریقے اختیار کیے جاسکتے ہیں' مثلاً مختلف زبانوں میں سیرت سے متعلق مؤثر لٹریچر تیار کر کے عام کیا جائے۔ غیر مسلم عوام کے سامنے سیرتِ رسول ﷺ کے رحمت والے پہلو اور آپ ﷺ کی وہ تعلیمات جو انسانی رواداری اور امنِ عالَم پر مبنی ہیں' کو رکھا جائے۔ غیر مسلموں کے اہلِ علم طبقہ کے لیے علمی انداز اختیار کیا جائے' مختلف طبقوں سے تعلق رکھنے والے افراد کے الگ الگ اجلاس بھی منعقد کریں۔ اسی طرح مسلم ڈاکٹر غیر مسلم ڈاکٹروں کو مدعو کریں' تاجر حضرات غیر مسلم تاجروں کے اجلاس منعقد کریں اور ان کے سامنے سیرت کے پہلوؤں کو اجاگر کریں۔ پھر یہ کہ سیرت النبی ﷺ کے بیان کو ماہِ ربیع الاوّل تک محدود نہ کر دیا جائے' بلکہ یہ پروگرام سارا سال جاری رہنے چاہئیں۔

اگر سیرت النبی ﷺ کے جلسوں اور کانفرنسز میں سیرت کے رسمی بیان کے ساتھ ساتھ مندرجہ بالا دستور العمل کو بروئے کار لانے کا اہتمام کیا جائے تو کوئی وجہ نہیں کہ سیرتِ سرورِ عالَم ﷺ کی خوشبو سے سارا عالَم منور نہ ہو' مسلمانوں میں اتباعِ سُنّت کا ذوق ایک بار پھر بیدار نہ ہو' غیر مسلموں کو مطالعۂ سیرت کی ترغیب نہ ہو' جو ان میں سے سعید روحوں کے قبولِ اسلام کی نوید بھی ثابت ہوسکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ تمام مسلمانوں کو اس دستور العمل کے مطابق اپنے اپنے دائرۂ کار میں اپنی ذِمّہ داریاں پوری دیانت وامانت کے ساتھ ادا کرنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین!

❁❁❁

قرآن کا معجزہ

اُمِّ احسن

قرآن حکیم کے مطالعہ سے ہمیں پتہ چلتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے بعض انبیاء کرام علیہم السلام کو کچھ معجزے عطا فرمائے۔ حضرت موسیٰ علیہ السلام کو عصا اور ''یدِ بیضا'' کے معجزے دیے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اللہ تعالیٰ کے حکم سے مادرزاد اندھے اور کوڑھی کو اچھا کر دیتے تھے اور آپ مُردوں کو تھوڑی دیر کے لیے زندہ کر دیتے تھے۔ وہ مٹّی کے گارے سے پرندے کی شکل بناتے اور اس میں پھونک مارتے تو وہ زندہ پرندہ بن کر اُڑ جاتا تھا۔ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کا بِن باپ پیدا ہونا اور زندہ آسمان پر اُٹھایا جانا بھی معجزہ تھا۔

حضرت سلیمان علیہ السلام کا معجزہ یہ تھا کہ اللہ تعالیٰ نے جِنّوں اور پرندوں کے لشکر ان کے تابع کر دیے تھے۔ حضرت ابراہیم علیہ السلام کے لیے معجزے کے طور پر آگ کے الاؤ کو گُل وگلزار بنا دیا گیا۔ بعث بعد الموت کی دلیل کے لیے آپؑ نے اللہ تعالیٰ کے حکم سے چار پرندے ذبح کیے اور ان کے ٹکڑے مختلف پہاڑوں پر رکھ دیے۔ پھر جب اُنھوں نے ان پرندوں کو پکارا تو وہ زندہ ہو کر ان کی طرف پلٹ آئے۔ حضرت ایوب علیہ السلام کے پاؤں کی ضرب سے اللہ تعالیٰ نے صاف میٹھے پانی کا چشمہ جاری کر دیا۔ حضرت یوسف علیہ السلام کی قمیص سے ان کے والد حضرت یعقوب علیہ السلام کی بینائی لوٹ آئی۔ حضرت صالح علیہ السلام کی خاطر چٹان سے ایک اونٹنی معجزے کے طور پر پیدا ہوئی جسے ''اللہ کی اونٹنی'' کہا گیا۔ حضرت زکریا اور ابراہیم علیہما السلام کو بڑھاپے میں بانجھ بیویوں کے ذریعے اولاد دی گئی۔ حضرت یونس علیہ السلام کو مچھلی کے پیٹ سے زندہ نکال دیا گیا۔ ان سب معجزوں کا تجزیہ کیا جائے تو معلوم ہوگا کہ مستقل نوعیت کے معجزے صرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام کو عطا ہوئے اور بار بار ظاہر ہوتے رہے۔ کچھ حد تک حضرت سلیمان علیہ السلام کے لیے جنوں اور پرندوں کے لشکر مسخر کرنا بھی ایک مستقل نوعیت کا معجزہ تھا جو عمر بھر اُن کے ساتھ رہا۔ باقی تمام انبیاءؑ کے معجزے عارضی اور وقتی تھے جو ایک مرتبہ ظاہر ہوئے۔ دوسری اہم بات یہ ہے

کہ ایک لاکھ چوبیس ہزار انبیاء میں سے صرف چند انبیاء کو ہی معجزے دیے گئے اور ان میں بھی اکثر معجزے وقتی اور عارضی تھے۔ حضرت نوح، حضرت ہود، حضرت یعقوب، حضرت اسحاق، حضرت شعیب علیہم السلام جیسے جلیل القدر انبیاء کے بارے میں کسی معجزے کا ذکر نہیں ہے۔

اس سے جو اہم بات ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ نبوت کے لیے معجزے کا ہونا ضروری نہیں ہے۔ اگر اللہ تعالیٰ کی طرف سے کچھ انبیاء کو معجزے دیے گئے تو خاص ضرورت کے لیے دیے گئے۔ انبیاء کرام علیہم السلام کا کام اللہ تعالیٰ کا پیغام لوگوں تک پہنچانا اور عقلی دلائل سے اس پیغام کی صداقت ان پر واضح کرنا تھا۔ معجزے کچھ انبیاء کو اِتمامِ حُجّت کے لیے دیے گئے، لیکن ان کی وجہ سے کوئی قوم انبیاء پر ایمان نہیں لائی۔ نہ فرعون کی قوم حضرت موسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی اور نہ ہی بنی اسرائیل کی اکثریت حضرت عیسیٰ علیہ السلام پر ایمان لائی۔ البتہ فرعون کے جادوگر جب حضرت موسیٰ علیہ السلام کے مدِمقابل آئے اور حضرت موسیٰ علیہ السلام کے عصا نے ان کے جھوٹے طلسم کو نگلنا شروع کر دیا تو اُن پر حق منکشف ہو گیا اور وہ اُسی وقت سجدے میں گر پڑے اور اپنے ایمان کا علی رؤس الاشہاد اعلان کر دیا۔ اس لیے کہ وہ اپنے فن (جادو) کے منجھے ہوئے ماہرین تھے اور فوراً پہچان گئے تھے کہ ان کے جادو کے مقابلے میں جو کچھ حضرت موسیٰ علیہ السلام نے پیش کیا ہے وہ جادو سے ماوراء کوئی چیز ہے۔ لہٰذا جس حقیقت کا ادراک فرعون اور اس کے اُمراء نہ کر سکے وہ بجلی کے ایک کوند (flash) کی مانند آناً فاناً جادوگروں کے دلوں کے تاریک گوشوں کو روشن کر گئی اور اس کے نتیجے میں ان کو ایسا ایمان باللہ اور ایمان بالآخرۃ نصیب ہوا جس کی جرأتِ اظہار اور استقامت نے فرعون اور اس کے لاؤ لشکر کو پریشان کر دیا۔ ایمان لانے کے بعد فرعون کے ساتھ ان کی گفتگو سے پتہ چلتا ہے کہ جب فرعون نے ان کو دھمکی دی کہ ایمان لانے کی پاداش میں مَیں تمہارے ہاتھ پاؤں مخالف سمتوں سے کٹوا دوں گا اور تمہیں سولی چڑھا دوں گا تو اس کے جواب میں جادوگروں کا کیا ردِّعمل تھا۔

﴿قَالُوْا لَا ضَيْرَ ۫ اِنَّآ اِلٰى رَبِّنَا مُنْقَلِبُوْنَ ۝ اِنَّا نَطْمَعُ اَنْ يَّغْفِرَ لَنَا رَبُّنَا خَطٰيٰنَآ اَنْ كُنَّآ اَوَّلَ الْمُؤْمِنِيْنَ ۝﴾ (الشعراء)

''انہوں نے کہا: کچھ پرواہ نہیں، ہم اپنے رب کے حضور پہنچ جائیں گے اور ہمیں توقع ہے کہ ہمارا رب ہمارے سارے گناہ معاف کر دے گا، کیونکہ سب سے پہلے ہم

ایمان لائے ہیں۔‘‘

ظاہر ہے کہ اس قسم کا ایمان حقیقت کے اِدراک سے ہی حاصل ہوتا ہے۔

حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے پانچ سو سال بعد مکّہ مکرمہ میں نبی آخر الزماں محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو نبوت و رسالت کے منصب پر فائز کیا گیا تو کُفّارِ قریش نے آپؐ سے مطالبہ کیا کہ اگر آپؐ اللہ کے رسول ہیں تو ہمیں اس طرح کے معجزے دکھائیں جیسے پہلے انبیاء کو دیے گئے تھے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ مشرکینِ عرب ایک طرف تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے آپؐ کی نبوت کے ثبوت کے طور پر معجزات کا مطالبہ کرتے تھے‘ دوسری طرف حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام جن کے معجزوں کا ان کو علم تھا ان پر ایمان نہیں رکھتے تھے۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ان کا معجزوں کا مطالبہ کرنا محض ایک شرارت تھی اور آپؐ کی نبوت کا انکار ایک بہانہ تھا۔ ورنہ ان سے یہ توقع بالکل نہیں تھی کہ ان کو کوئی معجزہ دکھا دیا جاتا تو وہ ایمان لے آتے‘ کیونکہ اگر اُنھوں نے معجزے دیکھ کر ایمان لانا تھا تو سب سے پہلے حضرت موسیٰ اور حضرت عیسیٰ علیہما السلام پر ایمان لانا چاہیے تھا‘ جن کے معجزوں کا وہ حوالہ دیتے تھے۔ یہی بات اللہ تعالیٰ نے قرآن میں اس طرح بیان کی:

﴿فَلَمَّا جَآءَهُمُ الْحَقُّ مِنْ عِنْدِنَا قَالُوْا لَوْلَآ اُوْتِيَ مِثْلَ مَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى ؕ اَوَلَمْ يَكْفُرُوْا بِمَآ اُوْتِيَ مُوْسٰى مِنْ قَبْلُ ۚ﴾ (القصص:۴۸)

’’پھر جب ہمارے ہاں سے حق ان کے پاس آ گیا تو کہنے لگے کیوں نہ دیا گیا اس کو وہی کچھ جو موسیٰ کو دیا گیا؟ کیا یہ لوگ اس کا انکار نہیں کر چکے جو اس سے پہلے موسیٰ کو دیا گیا تھا؟‘‘

یہ بات کہ یہ لوگ کوئی نشانی دیکھ کر بھی ایمان لانے والے نہیں تھے‘ قرآن حکیم میں اس طرح فرمائی گئی:

﴿وَلَوْ فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ۝۱۴ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ۝۱۵﴾ (الحجر)

’’اور اگر ہم ان پر آسمان سے کوئی دروازہ کھول دیتے اور وہ دن دیہاڑے اس پر چڑھنے بھی لگتے تب بھی وہ یہی کہتے کہ ہماری آنکھوں کو دھوکہ ہو رہا ہے بلکہ ہم پر جادو کر دیا گیا ہے۔‘‘

﴿وَلَوْ نَزَّلْنَا عَلَيْكَ كِتٰبًا فِيْ قِرْطَاسٍ فَلَمَسُوْهُ بِاَيْدِيْهِمْ لَقَالَ الَّذِيْنَ

كَفَرُوْٓا اِنْ هٰذَآ اِلَّا سِحْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۷﴾ (الانعام)

’’(اے پیغمبر صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) اگر ہم آپ پر کاغذ پر لکھی لکھائی کوئی کتاب بھی اُتار دیتے اور یہ اُسے اپنے ہاتھوں سے چھو کر بھی دیکھ لیتے تب بھی جنہوں نے حق سے انکار کیا ہے وہ یہی کہتے کہ یہ تو صریح جادو ہے۔‘‘

قرآن کریم میں کُفّار و مشرکین کی جانب سے نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے معجزے کے مطالبے کا ذکر ہمیں پچیس مقامات پر ملتا ہے اور ہر جگہ موقع کی مناسبت سے اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کا جواب بھی دیا گیا ہے‘ لیکن سورۃ العنکبوت میں ایک حتمی بات کہی گئی اور وہ یہ کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو دیا گیا معجزہ اور آپؐ کی نبوت کا ثبوت یہ قرآن مجید ہے جو آپؐ پر نازل کیا گیا:

﴿وَقَالُوْا لَوْلَآ اُنْزِلَ عَلَيْهِ اٰيٰتٌ مِّنْ رَّبِّهٖ ؕ قُلْ اِنَّمَا الْاٰيٰتُ عِنْدَ اللّٰهِ ؕ وَاِنَّمَآ اَنَا نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ ۝۵۰ اَوَلَمْ يَكْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا عَلَيْكَ الْكِتٰبَ يُتْلٰى عَلَيْهِمْ ؕ اِنَّ فِيْ ذٰلِكَ لَرَحْمَةً وَّذِكْرٰى لِقَوْمٍ يُّؤْمِنُوْنَ ۝۵۱﴾

’’یہ لوگ کہتے ہیں کیوں نہ اُتاری گئیں اس شخص پر نشانیاں (معجزات) اس کے رب کی طرف سے؟ کہو نشانیاں تو اللہ تعالیٰ کے پاس ہی ہیں اور مَیں تو صرف خبردار کرنے والا ہوں کھول کھول کر۔ اور کیا ان لوگوں کے لیے یہ (نشانی) کافی نہیں ہے کہ ہم نے آپؐ پر کتاب نازل کی جو اُنھیں پڑھ کر سنائی جاتی ہے؟ درحقیقت اس میں رحمت ہے اور نصیحت ان لوگوں کے لیے جو ایمان لاتے ہیں۔‘‘

یعنی قرآن حکیم جیسی کتاب کا نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم پر نازل ہونا کیا بجائے خود اتنا بڑا معجزہ نہیں ہے کہ آپؐ کی رسالت پر ایمان لانے کے لیے کافی ہو؟ کیا اس کے بعد بھی کسی اور معجزے کی ضرورت باقی رہ جاتی ہے؟ دوسرے معجزے تو جنہوں نے دیکھے ان کے لیے معجزے تھے‘ مگر یہ معجزہ تو ہر وقت تمہارے سامنے ہے۔ تمہیں آئے دن پڑھ کر سنایا جاتا ہے‘ تم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہو۔ یہی بات سورۃ ’’ق‘‘ میں اس طرح کہی گئی:

﴿قٓ ۟ وَالْقُرْاٰنِ الْمَجِيْدِ ۝۱ بَلْ عَجِبُوْٓا اَنْ جَآءَهُمْ مُّنْذِرٌ مِّنْهُمْ فَقَالَ الْكٰفِرُوْنَ هٰذَا شَيْءٌ عَجِيْبٌ ۝۲﴾

’’ق۔ قسم ہے قرآن مجید کی۔ بلکہ ان لوگوں کو تعجب اس بات پر ہوا کہ ایک خبردار کرنے والا انہی میں سے آ گیا۔ تو کافروں نے کہا کہ یہ تو بڑی عجیب سی بات ہے۔‘‘

یہاں قرآن کے لیے ''مجید'' کا لفظ استعمال کیا گیا بمعنی ایک بلند مرتبہ' باعظمت' بزرگ' کریم' کثیر العطاء' رہنما' بہت نافع۔ قرآن کے لیے ''مجید'' کی صفت استعمال کرنے کا مطلب یہ ہے کہ دُنیا کی کوئی کتاب اس کے مقابلے میں نہیں لائی جاسکتی۔ اپنی زبان اور ادب کے لحاظ سے بھی وہ معجزہ ہے اور اپنی تعلیم اور حکمت کے لحاظ سے بھی معجزہ۔

ایسی کتاب صرف اللہ تعالیٰ ہی کی طرف سے وحی کے ذریعے نازل ہوسکتی ہے' کسی انسان کی تالیف نہیں ہوسکتی۔ اور جس شخص پر یہ کتاب نازل ہورہی ہے وہ لامحالہ اللہ کا رسول (ﷺ) ہی ہوسکتا ہے۔ اس لیے اس بات میں کوئی تعجب کرنے کی وجہ نہیں ہے کہ آپؐ اللہ کے سچے رسول ہیں۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ حضرت محمد ﷺ اُمّی تھے' یعنی آپؐ نے کسی سے پڑھنا لکھنا نہیں سیکھا تھا۔ قریشِ مکّہ اور تمام اہلِ عرب اس حقیقت سے باخبر تھے۔ مشرکینِ عرب یہ بات اچھی طرح جانتے تھے کہ آپ ﷺ کے پاس کوئی لائبریری نہیں تھی جس سے استفادہ کر کے آپ ﷺ قرآن کی آیات بنا بنا کر لاتے۔ آپؐ کے گھر سے کبھی کوئی کاغذ کا ایک پُرزہ بھی برآمد نہیں ہوا جس پر کوئی عبارت لکھی ہوئی ہو۔ پھر اُمّی ہونے کے باوجود آپؐ کی زبان پر قرآن کی انتہائی فصیح و بلیغ مضامین پر مشتمل آیات جاری ہونا ایک معجزہ ہی تھا۔

نبی کریم ﷺ نبوت کے منصب پر فائز ہونے سے پہلے چالیس سال مکّہ مکرمہ میں رہے۔ پھر جب آپؐ کو نبوت عطا ہوئی تو ایسا کلام زبان پر جاری ہو گیا جس کی کوئی مثال نہ اُس زمانے میں موجود تھی اور نہ اس کے بعد کوئی ایسا کلام لا سکا۔ اس کلام میں ایسی تعلیمات بھی تھیں جن سے قبل ازیں خود نبی کریم ﷺ ناواقف تھے' پھر یکا یک غیب سے یہ مضامین آپؐ کی زبان سے ادا ہونے لگے۔ یہ قرآن کا عظیم معجزہ تھا۔ پھر زندگی کی آخری ساعت تک آپ ﷺ انہی لوگوں میں رہے۔ احادیث میں اب بھی محفوظ ہے کہ آپ ﷺ کا طرزِ کلام کیا تھا اور کتاب اللہ کی آیات کا طرزِ بیان کیا ہے۔ ان میں زمین وآسمان کا فرق سب کو نظر آتا ہے۔ حتیٰ کہ جہاں آپ ﷺ کے کسی خطبے کے بیچ میں کلام اللہ کی کوئی عبارت آجاتی ہے تو وہاں دونوں کی زبان کا فرق بالکل نمایاں نظر آتا ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ ۖ فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ ؕ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ ۝۱۶﴾ (یونس)

''اور کہو: اگر اللہ کی مشیت یہی ہوتی تو مَیں قرآن تمہیں کبھی نہ سناتا اور وہ تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہ دیتا' آخر اس سے پہلے مَیں ایک عمر تمہارے درمیان گزار چکا ہوں۔ کیا تم لوگ عقل سے کام نہیں لیتے؟''

﴿اَمْ يَقُوْلُوْنَ افْتَرٰىهُ ؕ قُلْ فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا مَنِ اسْتَطَعْتُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝۳۸﴾ (یونس)

''کیا یہ لوگ کہتے ہیں کہ پیغمبر نے اس کتاب کو خود تصنیف کر لیا ہے؟ کہو: اگر تم اپنے اس الزام میں سچے ہو تو ایک سورۃ اس جیسی تصنیف کر لاؤ اور اللہ تعالیٰ کو چھوڑ کر جس جس کو بلا سکتے ہو مدد کے لیے بلا لو!''

﴿قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰٓى اَنْ يَّاْتُوْا بِمِثْلِ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا يَاْتُوْنَ بِمِثْلِهٖ وَلَوْ كَانَ بَعْضُهُمْ لِبَعْضٍ ظَهِيْرًا ۝۸۸﴾ (بنی اسرائیل)

''کہہ دو: اگر انسان اور جن سب کے سب مل کر اس قرآن جیسی کوئی چیز لانے کی کوشش کریں تو نہ لا سکیں گے' چاہے وہ سب ایک دوسرے کے مددگار ہی کیوں نہ ہوں۔''

علمائے یہود کے بارے میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ وہ اپنی کتاب (تورات) میں تحریف کرنے میں بہت ماہر تھے۔ وہ اپنے پاس سے ایک آیت گھڑ لیتے اور اسے تورات کی آیتوں میں اس طرح شامل کر دیتے کہ لوگ پہچان نہ سکتے تھے۔ ان کا مقصد ایسی آیتوں سے لوگوں کو خوش کر کے کچھ پیسے بٹورنا ہوتا تھا۔ ان کی اس مہارت اور بد دیانتی کا ذکر قرآن کریم میں اس طرح کیا گیا ہے:

﴿فَوَيْلٌ لِّلَّذِيْنَ يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ۗ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا ؕ فَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا كَتَبَتْ اَيْدِيْهِمْ وَوَيْلٌ لَّهُمْ مِّمَّا يَكْسِبُوْنَ ۝۷۹﴾ (البقرۃ)

''پس ہلاکت اور تباہی ہے ان لوگوں کے لیے جو اپنے ہاتھوں سے کتاب (کی کچھ آیات) لکھتے ہیں اور پھر لوگوں سے کہتے ہیں کہ یہ آیات اللہ کی طرف سے نازل ہوئی ہیں تاکہ اس کے معاوضہ میں تھوڑا سا فائدہ حاصل کر لیں۔ ان کے ہاتھوں کا لکھا بھی ان کے لیے تباہی کا سامان ہے اور ان کی یہ کمائی بھی ان کے لیے موجبِ ہلاکت ہے۔''

یعنی جو علماء یہود تورات میں تحریف کے لیے اپنی طرف سے آیات گھڑ لینے میں بہت مشّاق اور ماہر تھے' قرآن کے مقابلے میں ایک بھی آیت بنا کر نہ لا سکے اور اس کے بعد بھی اہلِ کتاب

یا کسی شخص کو کبھی ایسی جرأت نہ ہوسکی۔ یہ قرآن کا عظیم معجزہ ہے۔ قرآن مجید کے علاوہ دنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کی حفاظت کی کوئی گارنٹی دے سکتا ہو' لیکن قرآن کی حفاظت کا ذمہ خود اللہ تعالیٰ نے لیا ہے' جیسا کہ ارشاد فرمایا:

﴿اِنَّا نَحۡنُ نَزَّلۡنَا الذِّکۡرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوۡنَ ۝۹﴾ (الحجر)

''ہم نے ہی یہ ذکر (قرآن) نازل کیا ہے اور ہم خود ہی اس کے نگہبان ہیں۔''

قرآن کریم وحی کے ذریعے نبی کریم ﷺ کو عطا کیا گیا' اس لیے سب سے پہلی ضرورت یہ تھی کہ خود آپ ﷺ کو اس پر مکمل عبور حاصل ہو کہ آپؐ اُسے جوں کا توں صحیح الفاظ کے ساتھ دوسروں تک پہنچا دیں۔ اس بات کا ذمہ بھی خود اللہ تعالیٰ نے لیا کہ قرآن آپ کے قلب و ذہن میں اصل الفاظ و معانی کے ساتھ محفوظ ہو جائے۔ یہ بات قرآن میں اس طرح فرمائی گئی:

﴿لَا تُحَرِّكۡ بِهٖ لِسَانَكَ لِتَعۡجَلَ بِهٖ ۝۱۶ اِنَّ عَلَيۡنَا جَمۡعَهٗ وَقُرۡاٰنَهٗ ۝۱۷ فَاِذَا قَرَاۡنٰهُ فَاتَّبِعۡ قُرۡاٰنَهٗ ۝۱۸ ثُمَّ اِنَّ عَلَيۡنَا بَيَانَهٗ ۝۱۹﴾ (القیامۃ)

''(اے نبی ﷺ!) اس وحی کو جلدی جلدی یاد کرنے کے لیے اپنی زبان کو حرکت نہ دیں۔ اس کو یاد کروا دینا اور پڑھوا دینا ہمارے ذمّے ہے۔ لہٰذا جب ہم اسے پڑھ رہے ہوں تو اس کی قراءت کو غور سے سنتے رہیں۔ پھر اس کا مطلب سمجھا دینا بھی ہمارے ذمہ ہے۔''

﴿سَنُقۡرِئُكَ فَلَا تَنۡسٰٓى ۝۶ اِلَّا مَا شَآءَ اللّٰهُ ؕ﴾ (الاعلیٰ)

''ہم آپؐ کو پڑھوا دیں گے' پھر آپؐ نہیں بھولیں گے' سوائے اس کے جسے اللہ چاہے۔''

قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کا یہ معجزہ ہے کہ وحی کے ذریعے جو آیات اور سورتیں آپؐ پر نازل ہوتی تھیں وہ آپ ﷺ کو خود بخود ازبر ہو جاتی تھیں۔ ہم لوگوں کی طرح آپ ﷺ کو حفظ نہیں کرنی پڑتی تھیں۔

نبی کریم ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق ؓ نے اپنے دورِ خلافت میں حضرت عمر ؓ کے مشورے سے یہ فیصلہ کیا کہ قرآن کریم کا ایک سرکاری نسخہ تیار کیا جائے اور اس مستند نسخے کو ہمیشہ کے لیے معیار قرار دے دیا جائے۔ چنانچہ حضرت زید بن ثابت انصاری ؓ کو جو نبی کریم ﷺ کے کاتب (سیکرٹری) رہ چکے تھے اس کام پر مامور کیا گیا۔

قاعدہ یہ مقرر کیا گیا کہ ایک طرف تو قرآن کے وہ تمام لکھے ہوئے اجزاء فراہم کر لیے جائیں جو آپ ﷺ نے کاتبانِ وحی کو قلمبند کرائے تھے۔ دوسری طرف صحابہ کرام ؓ میں سے جس کے پاس پورا قرآن یا اس کا کوئی حصّہ لکھا ہوا موجود تھا وہ ان سے لے لیا جائے' پھر حُفّاظ قرآن سے بھی مدد لی جائے۔ ان تینوں ذرائع کی متفقہ شہادت پر کامل صحت کا اطمینان کرنے کے بعد قرآن مجید کا ایک ایک لفظ مصحف میں ثبت کیا جائے۔ اس تجویز کے مطابق قرآن مجید کا ایک مستند نسخہ تیار کر کے اُمّ المؤمنین حضرت حفصہ ؓ کے ہاں رکھوا دیا گیا۔ حضرت عثمان ؓ کی خلافت کے زمانے میں جب اسلامی سلطنت کی سرحدیں دور دور تک پھیل گئیں تو اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس معیاری نسخہ قرآن کی نقلیں شائع کر کے تمام ممالک اسلامیہ میں بھیج دی جائیں۔ چنانچہ ایسا ہی کیا گیا۔

قرآن حکیم کا معجزہ یہ ہے کہ اس میں اللہ تعالیٰ کی ذات' صفات' اختیارات اور حقوق' آخرت' ملائکہ' کائنات کی تخلیق' انسانی زندگی کی ابتداء' موت' عالمِ برزخ' یومِ حشر' میزان' جنّت اور دوزخ کا تذکرہ موجود ہے۔ اس سے قبل جو آسمانی کتابیں نازل ہوئیں وہ اپنی اصلی حالت میں موجود نہیں ہیں۔ اس لیے انسانیت کے لیے علم کی روشنی کا ذریعہ قیامت تک کے لیے صرف قرآن مجید ہی ہے۔ قرآن میں متعدد مقامات پر اس حقیقت کی طرف توجّہ دلائی گئی ہے۔ ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿وَعِنۡدَهٗ مَفَاتِحُ الۡغَيۡبِ لَا يَعۡلَمُهَاۤ اِلَّا هُوَ ؕ وَيَعۡلَمُ مَا فِى الۡبَرِّ وَالۡبَحۡرِ ؕ وَمَا تَسۡقُطُ مِنۡ وَّرَقَةٍ اِلَّا يَعۡلَمُهَا وَلَا حَبَّةٍ فِىۡ ظُلُمٰتِ الۡاَرۡضِ وَلَا رَطۡبٍ وَّلَا يَابِسٍ اِلَّا فِىۡ كِتٰبٍ مُّبِيۡنٍ ۝۵۹﴾ (الانعام)

''اُسی کے پاس غیب کی کنجیاں ہیں جنھیں اُس کے سوا کوئی نہیں جانتا۔ بحر و بَر میں جو کچھ ہے وہ سب سے واقف ہے (کسی درخت سے) گرنے والا کوئی پتّا ایسا نہیں جس کا اُسے علم نہ ہو اور زمین کے تاریک پردوں میں کوئی دانہ ایسا نہیں جس سے وہ باخبر نہ ہو۔ خشک اور تر سب کچھ ایک کھلی کتاب میں لکھا ہوا ہے۔''

یعنی علمِ کُل کا مالک صرف اللہ تعالیٰ ہے' وہ ماضی' حال اور مستقبل کی ہر چیز کا علم رکھتا ہے۔ کائنات کا ہر ذرّہ اُس کی نظر میں ہے۔ اپنے علم میں سے وہ جب چاہتا ہے اور جتنا چاہتا ہے اپنے بندوں کو عطا کرتا ہے۔

قرآن مجید کا ایک معجزہ یہ ہے کہ اس نے مستقبل میں وقوع پذیر ہونے والے واقعات کے بارے میں پیشگی خبریں اور بشارتیں دیں۔ ان میں بہت سی پیشین گوئیاں نبی کریم ﷺ کی زندگی میں ہی پوری ہوگئیں' کچھ بعد میں ہوئیں اور کچھ آئندہ ہوں گی۔ قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ یہ دُنیا بھر میں سب سے زیادہ پڑھی جانے والی کتاب ہے۔

سورۃ المزمل بالکل ابتدائی دور کی سورت ہے۔ اس میں رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے فرمایا گیا:

﴿يٰٓاَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ ۝١ قُمِ الَّيْلَ اِلَّا قَلِيْلًا ۝٢ نِّصْفَهٗٓ اَوِ انْقُصْ مِنْهُ قَلِيْلًا ۝٣ اَوْ زِدْ عَلَيْهِ وَرَتِّلِ الْقُرْاٰنَ تَرْتِيْلًا ۝٤﴾

''اے کمبل میں لپٹ کر لیٹنے والے (ﷺ)! آپ کھڑے رہا کریں رات کو (نماز میں) سوائے اس کے تھوڑے سے حصّے کے۔ (یعنی) اس کا آدھا یا اس سے تھوڑا کم کر لیجیے۔ یا اس پر تھوڑا بڑھا لیں اور ٹھہر ٹھہر کر قرآن پڑھتے جایئے۔''

گویا قیام اللّیل کا اصل لازمہ قرآن مجید کی تلاوت ہے اور وہ بھی ترتیل کے ساتھ۔ واضح رہے کہ حضور ﷺ کو یہ حکم نبوت کے بالکل ابتدائی دور میں دے دیا گیا تھا۔

معراج کے موقع پر جب پانچ وقت کی نمازوں کی فرضیت کا حکم دیا گیا تو نماز کے بارے میں یہ آیات نازل ہوئیں:

﴿اَقِمِ الصَّلٰوةَ لِدُلُوْكِ الشَّمْسِ اِلٰى غَسَقِ الَّيْلِ وَقُرْاٰنَ الْفَجْرِ ۭ اِنَّ قُرْاٰنَ الْفَجْرِ كَانَ مَشْهُوْدًا ۝٧٨ وَمِنَ الَّيْلِ فَتَهَجَّدْ بِهٖ نَافِلَةً لَّكَ ۖ عَسٰٓى اَنْ يَّبْعَثَكَ رَبُّكَ مَقَامًا مَّحْمُوْدًا ۝٧٩﴾ (بنی اسرائیل)

''نماز قائم کرو زوالِ آفتاب سے لے کر رات کے اندھیرے تک اور فجر کے قرآن کا بھی التزام کرو' کیونکہ قرآنِ فجر میں فرشتے حاضر ہوتے ہیں۔ اور رات کو اس (قرآن) کے ساتھ تہجد پڑھو' (اے نبی ﷺ!) یہ آپؐ کے لیے نفل ہے' بعید نہیں کہ آپؐ کا ربّ آپؐ کو مقامِ محمود پر فائز کر دے۔''

اس طرح قرآن کا نزول شروع ہونے کے ساتھ ہی اس بات کا اہتمام کر دیا گیا کہ قرآن بار بار پڑھا جائے اور نماز قرآن کے مسلسل پڑھے جانے کا سب سے اہم ذریعہ ہے۔

نبی کریم ﷺ نے اپنے ارشادات کے ذریعے مسلمانوں کو قرآن مجید سے تعلق پیدا

کرنے اور اس کی تلاوت کرنے اور خوش الحانی سے پڑھنے کی ترغیب دی۔ ذیل میں چند احادیث بیان کی جا رہی ہیں۔

☆ حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ''جس نے اللہ تعالیٰ کی کتاب سے ایک حرف پڑھا اس کے لیے اس کے بدلے میں ایک نیکی ہے اور یہ ایک نیکی دس نیکیوں کے برابر ہے۔ مَیں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ الف ایک حرف ہے' لام ایک حرف ہے اور میم ایک حرف ہے' (گویا صرف الٓمٓ پڑھنے سے تیس نیکیاں مل جاتی ہیں۔)'' (ترمذی)

☆ حضرت برّاء بن عازب رضی اللہ عنہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: ((زَيِّنُوا الْقُرْآنَ بِأَصْوَاتِكُمْ)) (رواہ ابوداؤد والنسائی) ''قرآن کو اپنی آوازوں سے مزیّن کرو''۔ یعنی ترتیل اور تجوید سے قرآن پڑھو۔

قرآن کا ایک معجزہ یہ ہے کہ دنیا میں کروڑوں مسلمان اس کے معنی نہ سمجھنے کے باوجود اس کو پڑھتے ہیں۔ یہ شرف دنیا میں کسی کتاب کو حاصل نہیں۔ قرآن کا ایک معجزہ یہ بھی ہے کہ یہ دنیا کی واحد کتاب ہے جو حفظ کی جاتی ہے۔ نبی کریم ﷺ نے اپنے مختلف ارشادات میں قرآن کی آیات کو حفظ کرنے کی ترغیب دلائی ہے اور حفظِ قرآن کی فضیلت بیان فرمائی ہے۔

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ کے دورِ خلافت میں نمازِ تراویح کو خاص شکل دی گئی اور بیس رکعتوں میں پورا قرآن ختم کرنے کی ترتیب بنائی گئی۔ اس کے لیے لازم تھا کہ کچھ لوگ پورا قرآن مجید حفظ کریں اور اپنی امامت میں نمازیوں کو قرآن سنائیں۔ رسول اللہ ﷺ پر قرآن کریم ۲۳ سال تک بتدریج نازل ہوتا رہا لیکن اس کی تعلیمات کی یکسانیت ہمیشہ قائم رہی۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ قرآن انسانی کلام نہیں' بلکہ اللہ کا کلام ہے جو وحی کے ذریعے نبی اکرم ﷺ کو عطا کیا گیا۔

دُنیا میں اس وقت چھ ارب ستّر کروڑ انسان آباد ہیں۔ ان میں مسلمانوں کی تعداد اگرچہ صرف ایک ارب پچاس کروڑ ہے لیکن اس کے باوجود قرآن کریم دُنیا بھر میں سب سے زیادہ شائع ہونے والی کتاب ہے۔ اگرچہ صحیح اعداد و شمار نہیں دیے جا سکتے لیکن یہ حقیقت ہے کہ اس وقت دُنیا میں موجود قرآن کے نسخوں کی تعداد کسی بھی دوسری کتاب کے مقابلے میں سب سے

زیادہ ہے۔ یہ بھی قرآن کا عظیم معجزہ ہے۔

قرآن کریم کے علاوہ دُنیا کی کوئی کتاب ایسی نہیں جس کے مضامین حتمی سچ پر مبنی ہوں' جبکہ قرآن کی ہر بات حتمی سچ ہے' کیونکہ یہ ربّ العالمین کا کلام ہے' جو علیم وخبیر ہے' کائنات کی کوئی چیز اور ماضی' حال' مستقبل کی کوئی خبر اُس کی نظروں سے اوجھل نہیں ہے۔ اسی لیے قرآن کریم کی کوئی بات نہ تو اب تک غلط ثابت کی جاسکی ہے اور نہ آئندہ غلط ثابت ہوسکتی ہے۔

انسان کی تخلیق کے بارے میں قرآن کا بیان بھی معجزہ ہے:

﴿الَّذِیْٓ اَحْسَنَ كُلَّ شَیْءٍ خَلَقَهٗ وَبَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِیْنٍ ۝٧ ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِیْنٍ ۝٨ ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِیْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ ؕ قَلِیْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ ۝٩﴾ (السجدة)

”اُس (اللہ تعالیٰ) نے جو چیز بنائی خوب ہی بنائی اور انسان کی تخلیق کی ابتدا گارے سے کی۔ پھر اس کی نسل چلائی ایک حقیر پانی کے خلاصے سے۔ پھر اس کو نِک سُک سے درست کیا اور اس کے اندر اپنی روح پھونک دی اور تم کو کان دیے' آنکھیں دیں اور دل دیے۔ تم لوگ کم ہی شکر گزار ہوتے ہو۔“

تخلیقِ کائنات کے بارے میں قرآن حکیم میں بیان ہوا ہے کہ ایک وقت تھا جب یہ زمین و آسمان موجود نہیں تھے' پھر اللہ تعالیٰ نے اس کائنات کو اس شکل میں پیدا کرنے کا فیصلہ کیا اور چھ دنوں میں اس کام کی تکمیل فرمائی۔ اللہ تعالیٰ کے ان چھ دنوں کے دورانیے کا اندازہ ہم نہیں کرسکتے۔ مزید فرمایا:

﴿وَهُوَ الَّذِیْ خَلَقَ الَّیْلَ وَالنَّهَارَ وَالشَّمْسَ وَالْقَمَرَ ؕ كُلٌّ فِیْ فَلَكٍ یَّسْبَحُوْنَ ۝٣٣﴾ (الانبیاء)

”وہ اللہ ہی ہے جس نے رات اور دن بنائے' سورج اور چاند کو پیدا کیا۔ سب ایک ایک فلک میں تیر رہے ہیں۔“

قرآن حکیم میں سینکڑوں مقامات پر قیامت کے آنے کی خبر دی گئی ہے اور یہ بتایا گیا ہے کہ یہ کائنات جس میں ہم رہ رہے ہیں ہمیشہ رہنے والی نہیں ہے۔ ایک دن یہ سارا نظام لپیٹ دیا جائے گا اور یہ زمین' سورج' چاند' ستارے' آسمان سب درہم برہم ہوجائیں گے۔ اس کے بعد

ایک نئی کائنات تخلیق کی جائے گی جو اس موجودہ کائنات سے مختلف ہوگی۔ اس کی خبر قرآن میں اس طرح دی گئی ہے:

﴿یَوْمَ تُبَدَّلُ الْاَرْضُ غَیْرَ الْاَرْضِ وَالسَّمٰوٰتُ وَبَرَزُوْا لِلّٰهِ الْوَاحِدِ الْقَهَّارِ ۝٤٨﴾ (ابراھیم)

”جس دن ایک اور ہی زمین اس زمین سے بدل دی جائے گی اور آسمان بھی (بدل دیے جائیں گے) اور سب کے سب اللہ واحد القہار کے سامنے بے نقاب حاضر ہوجائیں گے۔“

اس مضمون کی ابتداء اس بات سے ہوئی تھی کہ کُفّارِ مکّہ نبی کریم ﷺ سے یہ مطالبہ کرتے تھے کہ وہ بھی اپنی نبوت کے ثبوت میں اسی طرح کے معجزات لے کر آئیں جیسے کہ پہلے گزرے ہوئے بعض انبیاء لے کر آئے تھے۔ اس پر اللہ تعالیٰ کی طرف سے انہیں یہ بتایا گیا تھا کہ حضور ﷺ کا **اصل معجزہ قرآن** ہے جو آپؐ کی نبوت کا سب سے بڑا ثبوت ہے۔ لیکن اس موضوع پر بات کرتے ہوئے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی کہ نبی کریم ﷺ کی ۲۳ سالہ نبوت کی زندگی میں آپؐ کے ہاتھوں سینکڑوں معجزات صادر ہوئے' جنہوں نے لوگوں کو حیران کردیا۔ لیکن آپ ﷺ کا **اصل معجزہ** پھر بھی قرآن ہی تھا۔ ❁❁❁

عصری تہذیبی مسائل اور حل

اور مسلم نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

شکیلہ عبدالحمید

تہذیب کے لغوی معنی کسی درخت کو کانٹ چھانٹ کر سنوارنا اور علم و ادب کے ذریعے اخلاق و کردار درست کرنا اور شائستہ کرنے کے ہیں اور اصطلاحاً کسی معاشرے کی بامقصد تخلیقات اور سماجی اقدار کے نظام کو تہذیب کہتے ہیں۔ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ رقم طراز ہیں:

''لوگ سمجھتے ہیں کہ کسی قوم کی تہذیب نام ہے اُس کے علوم و آداب، فنونِ لطیفہ، اطوار و معاشرت، اندازِ تمدن اور طرزِ سیاست کا، مگر حقیقت میں یہ نفس تہذیب نہیں۔ یہ سب باتیں تہذیب کے نتائج اور مظہر ہیں، ان سب کو چھوڑ کر ہمیں ان کی روح تک پہنچنا چاہیے۔''

تہذیب کے درج ذیل پانچ عناصر ترکیبی ہیں:

(۱) دُنیوی زندگی کا تصوّر (۲) زندگی کا نصب العین

(۳) عقائد و افکار (۴) تربیتِ افراد کے اصول

(۵) نظامِ اجتماعیت کے اصول

عصرِ حاضر میں دو بڑی تہذیبیں ہیں:

(۱) مغربی تہذیب (۲) اسلامی تہذیب

مغربی تہذیب —— معنی و مفہوم

اس تہذیب کی بنیاد حواس یا عقل سے حاصل ہونے والے علم پر ہے۔ جو علم حواس یا عقل کے علاوہ ہو اُس کا یہ انکار کرتی ہے۔ حواس سے مراد وہ پانچ قوتیں ہیں جنہیں حواسِ خمسہ کا نام دیا جاتا ہے۔ اس تہذیب کے علمبردار ''علم'' صرف اسی کو قرار دیتے ہیں جس کی مشاہدہ و تجربہ سے تصدیق و تائید ہو سکے اور جسے ثابت کیا جائے، یعنی علم کا اطلاق صرف اُس پر ہوگا جس کی پشت پر

حواس کی گواہی ہوگی اور جس کی توثیق و تصدیق حواس سے کی جائے گی۔ اس تہذیب کے نزدیک وحی و الہام محض واہمے ہیں اور علم کی دنیا میں نہ تو ان کی کوئی حقیقت ہے نہ قدر و قیمت۔

اسلامی تہذیب اور اس کو درپیش چیلنجز

اسلام ایک مکمل نظامِ زندگی ہے اور اس پورے نظام کا فکری حصّہ اسلامی تہذیب ہے۔ سیّد اسعد گیلانی لکھتے ہیں:

''ظاہر ہے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت نہ عربی ہے، نہ ایرانی، نہ نسلی ہے اور نہ قومی ہے۔ اسلامی تہذیب خالص قرآنی تہذیب ہے، اس میں نہ جوگیوں کے مراقبے اور رہبانیت کے طور طریقے ہیں اور نہ ظاہر پرستی کے لوازمات ہیں۔ اسلام کے نام پر جس چیز کو موسوم کیا گیا ہے وہ زندگی کا ایک خاص نقطہ نظر ہے۔ وہ اُمّتِ مُسلمہ کا ایک خاص قسم کا اجتماعی معاشرتی نظام ہے جو زندگی کے بارے میں ایک خاص نوعیت کا نظریاتی نقطہ نظر وجود میں لاتا اور پروان چڑھاتا ہے۔''

عصرِ حاضر میں اسلامی تہذیب کو درپیش چیلنجز درج ذیل ہیں:

(۱) علمی اور فکری یلغار (۲) معاشی یلغار

(۳) الیکٹرانک اور پرنٹ میڈیا کی یلغار (۴) علمی اور سائنسی تکنیکی شعبوں میں یلغار

(۵) اُمّتِ مُسلمہ پر دہشت گردی کی یلغار (۶) آزادیٔ نسواں کے مغربی تصوّر کی یلغار

(۱) علمی اور فکری یلغار: آج مغرب نے جہاں زندگی کے دیگر شعبوں میں مسلمانوں کو شکست دینے کا ارادہ کیا ہے، وہیں علمی و فکری طور پر بھی حملہ کر دیا ہے اور اس سلسلے میں وہ پوری طرح مسلّح ہیں۔

اس معرکے میں ایک طرف ان کے مستشرقین نے قرآن، رسول اللہ ﷺ اور احادیثِ نبویؐ کے خلاف ''محقّقانہ'' پیرائے میں اعتراض اٹھائے، دوسری طرف پادریوں نے اسلامی عقائد اور احکام کے خلاف مناظروں کا محاذ کھول دیا۔ تیسری طرف ایک ایسا نظامِ تعلیم وضع کیا اور اس کے لیے ایسی نصابی کتب رائج کیں کہ ان کو پڑھ کر ذہنوں میں اسلام کے خلاف بغاوت پیدا ہو جانے کے ساتھ ساتھ مغرب سے علمی و ادبی و تفریحی لٹریچر کی درآمد زور پکڑتی گئی اور لائبریریاں اس سے بھر گئیں۔ اتنا ہی نہیں، ایک خاص لباس اور نئے آداب و اطوار رائج کیے گئے۔ مسلمانوں کے سامنے روزی اور نوکری کے دروازے آہستہ آہستہ بند کرتے ہوئے ان کو

کہا گیا کہ اگر ان کے اندر آنا چاہو اور ترقی کرنا چاہو تو ہمارا ذہنی اور تہذیبی رنگ اختیار کرو۔

عصرِ حاضر میں غیر مسلم قومیں مسلمانوں پر ٹوٹ پڑی ہیں۔ انہوں نے مسلمانوں کی محبوب ترین شخصیت، پیغمبر آخر الزماں حضرت محمد ﷺ کو نشانہ تضحیک بنایا ہے، جن کی عزّت و تکریم اور حفاظت کا ذِمہ اللہ تعالیٰ نے خود لیا ہے۔

(۲) معاشی یلغار: مغرب کی سو سالہ محکومی نے مسلمانوں کے دل و دماغ کو کچھ ایسے سانچے میں ڈھال دیا ہے کہ وہ اپنے مسائل کو آزادی سے سوچنے کی بجائے آنکھیں بند کر کے اس ڈگر پر چل رہے ہیں جو مغرب نے انہیں دکھائی تھی۔ علاوہ ازیں معاشی خود انحصاری سے محروم کرنے کے لیے World Trade Organization جیسے معاہدات مسلمان ملکوں پر مسلّط کیے جا رہے ہیں۔ ملٹی نیشنل کمپنیز کا جال بچھایا جا چکا ہے، جس میں مسلمان پوری طرح جکڑے جا چکے ہیں۔

(۳) الیکٹرانک میڈیا: موجودہ دَور میں یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ ذرائع ابلاغ خواہ کسی بھی شکل میں ہوں، مثلاً ٹی وی، انٹرنیٹ، سوشل میڈیا، پرنٹ میڈیا وغیرہ، پوری طرح مغرب اور یہودیوں کے کنٹرول میں ہیں، جو ان کی مدد سے مخصوص افکار و خیالات پھیلا رہے ہیں، جو کسی سے ڈھکے چھپے نہیں ہیں۔ ان کی جانب سے بنائے جانے والے اور سپانسر کیے جانے والے پروگرام مثلاً ڈرامے، کارٹونز، ٹاک شوز وغیرہ دنیا میں لوگوں کے، خصوصاً نوجوان نسل کے ذہنی اور فکری دریچوں پر دستک دے رہے ہیں۔ ان کی برین واشنگ اور ذہن سازی کی جا رہی ہے، جو طبیعت اور فطرت پر بری طرح اثر انداز ہو رہی ہے۔ حتیٰ کہ امریکی یا برطانوی تلفظ ہی میں انگلش بولنا اس وقت بہت بڑا فیشن بن چکا ہے۔

(۴) علمی اور سائنسی تکنیکی شعبوں میں یلغار: عصر حاضر میں سائنس اور ٹیکنالوجی کا دور دورہ ہے۔ انسان اس سائنسی ترقی کی بدولت خلا پر اپنے پنجے گاڑ سکتا ہے اور دوسرے سیاروں پر زندگی بسر کرنے کی جستجو میں ہے۔ مغرب اسلامی دنیا پر اپنا دباؤ برقرار رکھنے کے لیے کوشش کرتا ہے کہ کوئی مسلم ملک جدید سائنسی ٹیکنالوجی حاصل کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ مغرب اسی کوشش میں ہے کہ اوّل تو مسلمانوں کے لیے حصولِ تعلیم ہی کو مشکل بنا دیا جائے اور اگر کوئی مسلمان تعلیمی میدان میں آگے آ بھی رہا ہو تو اُسے نظامِ تعلیم میں گرفتار کیا جائے کہ وہ نظریاتی طور پر اسلام سے دور اور مغرب زدہ ہو جائے۔ لارڈ میکالے اپنے اقتباس میں کہتا ہے:

''میں نے ایسا نظامِ تعلیم دیا ہے کہ اسے پڑھ کر مسلمان عیسائی نہیں بنیں گے تو کم از کم مسلمان بھی نہیں رہیں گے۔''

سیّد ابوالاعلیٰ مودودیؒ نے فرمایا:

''یہاں کالجوں اور یونیورسٹیوں میں جو تعلیم دی جا رہی ہے وہ اسلامی روح کو کچلنے والی ہے۔ وہ نوجوان طلبہ کو اپنے دین اور ماضی سے اس طرح بیگانہ و اجنبی بنا رہی ہے کہ تھوڑی مدّت بعد وہ اپنے آباء و اَجداد کو بھی نہ پہچان سکیں گے۔ حصولِ علم دین کی اس ضرورت کو دینی مدارس کی تعلیم بھی پورا نہیں کرتی۔ وہ مسائل بتا دیتی ہے لیکن تفقّہ پیدا نہیں کرتی۔ اس امر کی شدید ضرورت ہے کہ شامی اور ہدایہ کے بعد پیدا ہونے والے مسائل کو حل کرنے کی قابلیت پیدا کی جائے۔''

(۵) اُمّتِ مُسلمہ پر دہشت گردی کی یلغار: نائن الیون کے بعد عالَمِ کفر نے مسلم ممالک کو تاخت و تاراج کرنے کا سلسلہ شروع کیا، لیکن اُسی وقت سے مغرب میں اسلام کی مقبولیت کی رفتار میں پہلے سے کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ اسلام کی زبردست مقبولیت نے مغرب کی نیندیں حرام کر دی ہیں جس کی وجہ سے مغرب اب اوچھے ہتھکنڈوں پر اتر آیا ہے۔ مسلمان کو آج کل پوری دنیا میں دہشت گرد کے روپ میں پیش کیا جاتا ہے۔ امریکہ جہاں چاہتا ہے مسلم ممالک پر حملہ کر دیتا ہے۔ امریکہ نے عراق، شام، فلسطین اور افغانستان میں دہشت گردی کا بازار گرم کر رکھا تھا، جو اب افغانستان میں اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اپنے اختتام کو پہنچا ہے اور امریکہ یہاں سے ذلیل و خوار ہو کر نکلنے پر مجبور ہو گیا ہے۔

(۶) آزادیٔ نسواں کے مغربی تصوّر کی یلغار: مغربی تہذیب کی برق پاشیوں اور جلوہ سامانیوں نے اہلِ مشرق کو عموماً اور مسلمانوں کی نظروں کو خصوصاً جس طرح خیرہ کیا ہے وہ اب کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں۔ فحاشی و عریانی نے جس سیلِ رواں کی شکل اختیار کر لی ہے اُس نے ہماری ملّی اور دینی اقدار کو خس و خاشاک کی طرح بہا دیا ہے۔ مغربی تہذیب کی چمک دمک نے ہمیں کچھ اس طرح مبہوت کر دیا کہ ہم یہ بھی تمیز نہ کر سکے کہ اس چمکتی ہوئی شے میں زرِ خالص کتنا ہے اور کھوٹ کتنا؟ اس تند و تیز سیلاب کے مقابلے میں ہم اتنے بے بس ہو کر رہ گئے ہیں کہ ہماری اکثریت نے اپنے آپ کو پوری طرح اس کے حوالے کر دیا ہے۔ نتیجتاً ہمارا معاشرہ پست ہو گیا ہے، ہمارے خاندانی نظام کا شیرازہ بُری طرح منتشر ہو رہا ہے اور کوچہ کوچہ ہماری اس تہذیبی

خودکشی پر نوحہ کرتا ہے۔

صلیبی دُنیا کو پردے کے حوالے سے بھی اسلام کھٹکتا ہے۔ اس پر عورتوں کو دہشت زدہ کرنے کے حوالے سے زبانِ طعن دراز کرتے ہیں‘ جب کہ کئی ممالک میں سکارف پہننے پر پابندی لگادی گئی ہے۔ سکارف والی خواتین کے ساتھ بدتمیزی کی جاتی ہے‘ زبردستی سکارف اُتارا جاتا ہے۔ سکارف پہننے اور حجاب کرنے کے حوالے سے عدالتوں میں باقاعدہ کیس لڑے جارہے ہیں‘ حالانکہ عیسائیوں کے گرجا گھروں میں ان کی خواتین سکارف پہن کر رکھتی ہیں۔ ان کو تو امن کی دیویاں سمجھا جاتا ہے اور مسلم عورت کو دہشت گرد سمجھا جاتا ہے۔ موجودہ دور میں مسلمان آزاد عورتیں بھی اسلام سے اظہارِ بے زاری کرنے لگی ہیں۔ ایک امریکی یہودی برجز اپنی کتاب ’’آج کی عربی دنیا‘‘ میں کہتا ہے کہ ’’تعلیم یافتہ مسلمان عورت مذہبی تعلیمات سے بہت دور ہے اور معاشرے کو بے دین بنانے میں حد درجہ مفید ہے۔‘‘

عصرِ حاضر میں تعلیمی اداروں میں بے پردگی‘ بے حیائی اور بے راہ روی اسی فکری اغوا کا شاخسانہ ہے۔ آج کی عورت اپنے آپ کو اشتہار بنا کر پیش کر رہی ہے۔ موجودہ ذرائع ابلاغ نے ہماری اولادوں کے اخلاق و کردار کو تباہ کر دیا ہے‘ جس کے نتیجے میں آج کل کے ملکی حالات آپ کے سامنے ہیں۔ روزانہ اخبار‘ میڈیا کیا آئینہ دکھا رہا ہے۔ اس بدتہذیبی‘ بددیانتی اور اخلاقِ رذیلہ نے قومی وجود کے شجر ثمر آور کو آکاس بیل کی مانند اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔

عصری تہذیبی چیلنجز کے عالَمِ اسلام پر اثرات

ذیل میں کچھ منفی اور کچھ مثبت اثرات درج کیے جارہے ہیں:

- مثبت اثرات
  - (۱) صحت سے متعلق شعور
  - (۲) مغرب کے دوہرے معیار سے آگاہی
  - (۳) خواندگی میں اضافہ
  - (۴) عالمی مسائل سے آگاہی

(۱) صحت سے متعلق شعور: صحت سے مراد محض بیماریوں یا معذوری سے نجات ہی نہیں بلکہ اس سے مراد مکمل ذہنی و جسمانی اور معاشرتی تحفظ ہے۔ ۱۹۹۹ء کے خصوصی مشن میں ان کامیابیوں کا تفصیلی جائزہ لیا گیا اور خواتین کی صحت کے حوالے سے بنیادی اقدام کا فیصلہ کیا گیا

تاکہ صحت سے متعلقہ پروگرام پر موثر کام ہو سکے۔ ان کانفرنسوں کا نتیجہ یہ ہوا کہ شرح اموات میں نمایاں کمی واقع ہوئی۔

(۲) مغرب کے دوہرے معیار سے آگاہی: مغربی ذرائع ابلاغ کا ایک مثبت پہلو یہ ہے کہ مسلم دنیا کے خلاف مغرب کے دوہرے معیار سے ساری دنیا آگاہ ہو چکی ہے‘ جس کا نتیجہ یہ نکل رہا ہے کہ اہلِ مغرب خود ان پالیسیوں کے خلاف احتجاج کر رہے ہیں جو ان حکمرانوں نے مسلمانوں کے خلاف اختیار کی ہیں۔ مسلمانوں پر جو ظلم و ستم ہو رہا ہے اسے وہ چھپانے کی کوشش کرتے ہیں مگر کسی غیر مسلم کو تکلیف پہنچے تو شور مچایا جاتا ہے‘ لیکن اب میڈیا نے کافی حد تک عوام کو حالات سے آگاہ کیا ہے۔ جہاں میڈیا کے بُرے اثرات مرتب ہوئے ہیں وہاں کچھ لوگوں نے سچ بیان کرنے کے لیے اس کا مثبت استعمال کیا ہے۔ خاص طور پر گوانتاناموبے میں ہونے والے مظالم کی تشہیر سے امریکہ کی مقبولیت کا گراف بہت حد تک گر گیا ہے۔

(۳) تعلیمی شعور میں اضافہ: تغیّر و تبدّل کا قرآنی تصوّر انسان کو اُس کی قوتِ ارادی اور صلاحیتِ عملی کی بنا پر زمان و مکان میں مقامِ قوامیت عطا کرتا ہے۔ گویا انسان تاریخ کی پیداوار یا غلام نہیں ہے بلکہ تاریخ ساز ہے۔ ذرائع ابلاغ نے لوگوں میں تعلیمی شعور اُبھارنے میں اہم کردار ادا کیا ہے۔ اب تک جتنی بھی بین الاقوامی کانفرنسیں ہوئیں ان کا بھی اہم ایجنڈا لوگوں میں تعلیمی شعور اُجاگر کرنا تھا۔

(۴) عالمی مسائل سے آگاہی: ذرائع ابلاغ کے ذریعے سیاسی و عالمی مسائل کے پروگرام بھی عوام کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں۔ یوں تمام لوگ دنیا میں ہونے والے مسائل اور تبدیلی سے باخبر رہتے ہیں۔ عراق میں ابوغریب جیل اور کیوبا میں گوانتاناموبے کے امریکی بحری اڈّے میں مسلمان قیدیوں کو اذیت پہنچانے اور ان سے شرمناک سلوک کے متعدد واقعات بھی سامنے آئے ہیں۔ دنیا گلوبل ویلج بن چکی ہے اور دنیا میں کسی بھی ملک یا علاقے میں ہونے والے کسی واقعے یا سانحے سے متعلق لوگوں کو فوراً اطلاع پہنچ جاتی ہے۔

- منفی اثرات
  - (۱) مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا
  - (۲) خاندانی نظام کی تباہی

(۳) جرائم میں اضافہ (۴) فحاشی کا فروغ

(۵) تہذیبی اور ثقافتی تنزّل

(۱) مسلمانوں کے خلاف پروپیگنڈا: مسلمانوں کے دینی مدارس کو دہشت گردی کے تربیتی مراکز کی شکل میں پیش کیا جاتا ہے اور یہ بھی ظاہر کیا جاتا ہے کہ مسلمانوں میں اپنے علاوہ کسی دوسرے مذہب کو برداشت کرنے کی ہمت نہیں۔

مغربی میڈیا کی میزبانی سے ایک مردہ اصطلاح میں جان ڈالی گئی یعنی بنیاد پرستی (Fundamentalism)۔ یہ اصطلاح چند برس قبل افغانستان میں جنگ کے حوالے سے استعمال ہونی شروع ہوئی اور چند ہی برسوں میں اس نے دنیائے اسلام کو معذرت خواہانہ رویّہ اختیار کرنے پر مجبور کر دیا۔ مغربی میڈیا نے نہایت ہوشیاری اور عیاری سے بنیاد پرستی کا مطلب جہالت‘ ترقی دشمنی‘ دہشت گردی‘ دقیانوسی اور کٹر نظریات کے مفہوم کے طور پر پیش کیا‘ بلکہ اس قدر زور شور سے اس کا شور مچایا کہ ہر مسلمان ہاتھ باندھ کر کہنے لگا کہ حضور میں بنیاد پرست نہیں ہوں۔ اس منفی پروپیگنڈے کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج دنیا میں کہیں بھی دہشت گردی کی کوئی واردات ہو‘ اسے کسی نہ کسی طور پر مسلمانوں سے جوڑ دیا جاتا ہے۔

(۲) خاندانی نظام کی تباہی: یہ حقیقت ہے کہ خاندان معاشرے کا جزو ہے اور فرد اپنے خاندان کا جزو ہے۔ چنانچہ ایک معاشرے کا تصوّر بغیر خاندان کے محال ہے‘ جیسے ایک خاندان کا تصوّر افراد کے بغیر ناممکن ہے۔ نتیجتاً اگر فرد کے اندر کوئی خرابی پیدا ہوتی ہے تو خاندان پر براہِ راست اس کا اثر پڑتا ہے اور اگر خاندان میں کوئی فساد رونما ہو جائے تو معاشرہ آلودہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ مسلم معاشروں کو بگاڑنے کے عمل میں این جی اوز مرکزی کردار ادا کرتی ہیں۔ خصوصاً بیگمات کی این جی اوز جو مغربی دنیا سے مالی امداد لیتی ہیں‘ کبھی اشاروں میں اور کبھی کھل کر خاندانی بندھنوں کو ڈھیلا کرنے اور توڑنے کی بات کرتی ہیں۔ اسلام آباد میں مارچ ۲۰۲۰ء میں خواتین نے مارچ کیا جس میں ایسے پلے کارڈ اٹھائے گئے جن پر فحش اور عریاں الفاظ کا استعمال کر کے عورتوں کی آزادی اور حقوقِ نسواں کا آوازہ بلند کیا گیا۔ پلے کارڈز پر ’’میرا جسم میری مرضی‘ اپنا موزہ خود ڈھونڈو‘ اپنا بستر خود گرم کرو‘‘ جیسے فحش الفاظ کا چناؤ کیا گیا‘ جس سے صاف ظاہر تھا کہ یہ خاندانی نظام کو توڑنے کی بھرپور سازش تیار کی گئی ہے۔

بزرگوں کی شفقت اور محبّت کا مذاق اڑایا جاتا ہے اور مشترکہ خاندانی نظام سے پیدا ہونے والے نفسیاتی مسائل گنوائے جاتے ہیں۔ ٹی وی چینلز کے ذریعے ایسے ڈرامے تیار کیے اور دکھائے جاتے ہیں جن میں طلاق کو عام اور نکاح کو تماشا بنا دیا گیا ہے۔ شادی شدہ مرد و عورت کے نکاح کے بعد بھی غیر محرم لوگوں سے تعلقات کو عام کیا جا رہا ہے‘ جس سے خاندانی نظام کی جڑیں کمزور پڑنے لگی ہیں اور طلاق کی کثرت ہونے لگی ہے۔

(۳) جرائم میں اضافہ: ذرائع ابلاغ جرائم کی تشہیر میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ لوگوں کو ان جرائم اور مجرموں سے آگاہ کرنا اور بات ہے‘ مگر مجرموں کو ہیرو بنا کر پیش کرنا اور بات ہے۔ آج کل میڈیا پر مجرموں کی جس طرح تشہیر کی جاتی ہے اس کے نتائج بہت بھیانک نکلتے ہیں اور مسلم معاشروں پر اس کے بہت منفی اثرات مترتّب ہوتے ہیں۔

(۴) فحاشی کا فروغ: آج ہمارے ہاں بے حیائی اور عریانی دھڑلے سے پھیلائی جا رہی ہے۔ تمام ذرائع ابلاغ برائی کی اشاعت میں دھڑا دھڑ مصروف ہیں۔ کسی بھی اخبار یا رسالے کو اٹھا کر دیکھ لیں‘ نیم عریاں اشتہارات و تصاویر کا انبار نظر آئے گا۔ ٹی وی چینلز پر نیم عریاں ماڈلز اپنے جسموں کو لہراتی نظر آئیں گی اور چوراہوں پر بڑے بڑے بل بورڈز پر مختلف زاویوں سے ان کے جسموں کی نمائش نظر آئے گی۔ کبھی بازار یا سڑک سے گزریں یا سفر میں ہوں‘ ہر جگہ جذبات کو بھڑکانے اور خدا سے غافل کر دینے والی موسیقی سننی پڑے گی۔ ٹی وی وغیرہ پر فواحش اور گھٹیا حرکات باقاعدہ منظّم انداز میں پیش کی جاتی ہیں۔ چادر اور چار دیواری کا تحفّظ کالعدم ہے‘ لیکن اداروں میں غیر اسلامی محفلیں سجا کر زیب و زینت اور نمود و نمائش کا شیطانی چکر چلایا جاتا ہے اور فحاشی کو فروغ دیا جا رہا ہے۔

(۵) تہذیبی اور ثقافتی تنزّل:

(۱) مغربی تہوار

(۲) انگریزی زبان و لباس کا استعمال

(۱) مغربی تہوار: تہوار اور میلے ہر قوم کی مذہبی و ثقافتی اقدار و نظریات کے ترجمان ہوتے ہیں۔ اسلام کے تہوار ہیں: عیدالفطر اور عیدالاضحیٰ۔ نبی کریم ﷺ نے فرمایا: ’’جس کسی نے کسی قوم کی مشابہت اختیار کی وہ انہی میں سے ہے‘‘۔ (ابوداؤد) لیکن آج کل مغربی تہذیب

کے زیر اثر مسلم اقوام کی اپنی اقدار سے بغاوت اور مغرب کی بے ہودہ رسومات سے محبّت ابلیسی جال کا نتیجہ ہے۔ نیو ایئر نائٹ اور ویلنٹائن ڈے جیسے events کو منانا مغرب کی بھونڈی نقالی ہے۔ صہیونی میڈیا کے زیر اثر جنسی آوارگی، بے ہودگی اور خرافات کو ماڈرن ازم کے لیے ضروری تصوّر کیا جانے لگا ہے۔ مغربی ذرائع ابلاغ نے اس میں بڑھ چڑھ کر اپنا کردار ادا کیا ہے۔

(۲) انگریزی زبان ولباس کا استعمال: ابن خلدون نے اپنے ''مقدمہ تاریخ ابن خلدون'' میں اور شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ نے ''حجۃ اللہ البالغہ'' میں زبان کو ان بنیادی عوامل میں شامل کیا ہے جن سے کوئی اجتماع وجود میں آتا ہے اور ترقی پاتا ہے۔ آج مغربی زبان ولباس نے مسلمانوں کو ان کی زبان ولباس سے تقریباً محروم کر دیا ہے۔

مسلم نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

(سیرتِ طیّبہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی روشنی میں)

جوانی کو غنیمت جاننا

حضرت عبداللہ بن عباس رضی اللہ عنہما کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے ارشاد فرمایا:

((اِغْتَنِمْ خَمْسًا قَبْلَ خَمْسٍ : شَبَابَکَ قَبْلَ هِرَمِکَ، وَصِحَّتَکَ قَبْلَ سَقَمِکَ، وَغِنَاکَ قَبْلَ فَقْرِکَ، وَفَرَاغَکَ قَبْلَ شُغْلِکَ، وَحَيَاتَکَ قَبْلَ مَوْتِکَ)) (مستدرک حاکم)

''پانچ چیزوں کو پانچ چیزوں سے پہلے غنیمت جانو: (۱) اپنی جوانی کو بڑھاپے سے پہلے (۲) اپنی صحت کو بیماری سے پہلے (۳) اپنی مالداری کو فقیری سے پہلے (۴) اپنی فراغت کو مصروفیت سے پہلے (۵) اپنی زندگی کو موت سے پہلے۔''

سب سے پہلے نوجوانوں کو اس بات کا احساس ہونا چاہیے کہ وہ اپنے وقت کو ضائع نہ کریں، کیونکہ بڑھاپے میں سوائے ندامت اور پچھتاوے کے ان کے ہاتھ میں کچھ نہیں بچتا۔ تسبیح ومناجات صرف آخری عمر ہی کا کام نہیں بلکہ سورۃ البقرۃ کی ''آیۃ البِر'' کے حوالے سے ایک وسیع میدان نوجوانوں کے سامنے ہے اور ہر وہ چیز اور ہر وہ عمل جو انسانیت کے لیے نفع بخش ہو اور شیطان کے راستے سے ہٹ کر ہو وہ عبادت میں شمار ہوتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کے احکامات کے

مطابق گزاری جانے والی جوانی کے لیے یہ بشارت بھی ہے کہ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ''جو شخص اللہ کی راہ میں اسلام میں بوڑھا ہوا تو اس کا بڑھاپا قیامت کے دن اس کے لیے نور ہوگا۔'' (سنن نسائی)

قرآن اور نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

حضرت عمر فاروق رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا:

((اِنَّ اللّٰهَ يَرْفَعُ بِهٰذَا الْكِتَابِ اَقْوَامًا وَيَضَعُ بِهٖ آخَرِيْنَ)) (صحیح مسلم)

''اللہ تعالیٰ اس قرآن کے ذریعے قوموں کو عروج دیتا ہے اور اس (کو چھوڑنے) کے باعث ہی قوموں کو زوال بھی دیتا ہے۔''

کتابِ ہدایت یعنی قرآن پاک ہی وہ کتاب ہے جو انسان کو اپنی زندگی کا مقصد بھی دیتی ہے اور اس مقصد کے حصول کا طریقہ بھی بتاتی ہے۔ اس کتاب سے رہنمائی نہ لی جائے تو انسان دربدر کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ بقول شاعرِ مشرق ؎

وہ زمانے میں معزّز تھے مسلماں ہو کر　　اور تم خوار ہوئے تارکِ قرآں ہو کر!

موجودہ دور کے صلیبی مبلّغین نے رواں صدی کے اختتام تک براعظم افریقہ کے باشندوں کو مسیحی بنانے کے پروگرام پر عمل جاری رکھا ہے۔ ایمان کی اس جنگ میں ہمارا سامانِ حرب، ہماری تلوار اور ڈھال قرآن ہے۔ اب وہ وقت آ گیا ہے کہ نوجوان قرآن کو سامانِ حرب کے طور پر اپنائیں اور ایمان کے رکھوالے بن کر اپنے دین پر حملہ کرنے والوں کا مقابلے کرنے کا حوصلہ پیدا کریں۔ ازروئے الفاظِ قرآنی: ﴿وَجَاهِدْهُمْ بِهٖ جِهَادًا كَبِيْرًا ۝۵۲﴾ (الفرقان) ''(اے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم!) ان سے جہاد کیجیے اس قرآن کے ذریعے بہت بڑا جہاد۔''

اُسوۂ حسنہ اور نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

ارشادِ باری تعالیٰ ہے:

﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ لِّمَنْ كَانَ يَرْجُوا اللّٰهَ وَالْيَوْمَ الْاٰخِرَ وَذَكَرَ اللّٰهَ كَثِيْرًا ۝۲۱﴾ (الاحزاب)

''بے شک تمہارے لیے رسول اللہ (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی ذات میں بہترین نمونہ موجود ہے ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخرت کی امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ تعالیٰ کا ذکر کرتا ہے۔''

انسان اچھے اور برے‘ خوبصورت اور بدصورت‘ حسین اور قبیح‘ نیکی اور بدی کی پہچان موازنے اور تقابل سے کرتا ہے۔ روشنی کی قدر اور پہچان اندھیرے کی موجودگی میں ہی ہوتی ہے اور اندھیرے کی قباحتیں نور کے ساتھ موازنے سے سامنے آتی ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے اس قرآن کریم اور نبی کریم ﷺ کی شکل میں انسان کے سامنے ہدایت کا نمونہ رکھ دیا ہے۔ اس پر انسان اپنے آپ کو پرکھ سکتا ہے۔

مغربی دنیا اور نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ کا قول ہے: ’’رسول اللہ ﷺ نے فرمایا (مجھے حکم دیا) کہ میں سریانی زبان سیکھوں۔‘‘

مغرب آج سائنسی علوم اور ٹیکنالوجی میں بہت زیادہ ترقی کر گیا ہے‘ لیکن اخلاقی زوال‘ حیا باختگی کے حوالے سے قعرِ مذلت میں جا گرا ہے۔ کسی علم میں بجائے خود کوئی خرابی نہیں ہوتی اور نہ کوئی زبان محض زبان ہونے کی وجہ سے غلط ہوتی ہے‘ البتہ ہر زبان اور علم اپنے ساتھ اپنے لوگوں کی تہذیب بھی رکھتا ہے۔ اس لیے مغربی علوم کے اندر مغربی تہذیب کا رنگ بھی نمایاں ہے۔ اگر اسلامی تہذیب کے اصولوں سے ٹکراؤ رکھنے والی تہذیب کو الگ کر کے علوم حاصل کیے جائیں تو یہ قطعاً ممانعت کے درجے میں نہیں آتے بلکہ مستحب اور مباح ہوتے ہیں۔ حدیث مبارکہ کی روشنی میں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہمیں مغربی علوم بھی حاصل کرنے چاہئیں اور زبان بھی‘ مگر آفاقی اصولوں کو فراموش نہیں کرنا چاہیے۔

تعمیری اور تخریبی سرگرمیاں اور نوجوانوں کی ذِمّہ داریاں

قرآن مجید میں ارشاد ہے:

﴿كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ۭ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾﴾ (البقرۃ)

’’تم پر (اللہ کے راستے میں) لڑنا فرض کر دیا گیا ہے اور وہ تمہیں ناگوار ہے‘ مگر عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بُری لگے اور وہ تمہارے حق میں بھلی ہو‘ اور عجب نہیں کہ ایک چیز تم کو بھلی لگے اور وہ تمہارے لیے مضر ہو۔ (ان باتوں کو) اللہ ہی بہتر جانتا ہے‘ تم نہیں جانتے۔‘‘

تعمیر و تخریب کے حوالے سے کائنات پر نگاہ ڈالیں تو ہر جگہ تعمیر ہی نظر آتی ہے‘ کہیں بھی تخریبی کارروائی کا نشان نہیں ملتا۔ اسلام میں لغو باتوں سے گریز کو ایک مومن کی شان قرار دیا گیا ہے‘ لیکن لغو کی ممانعت کا ہرگز یہ مطلب نہیں کہ اسلام میں تفریح کی بھی ممانعت ہے۔ لغویات سے پاک تفریح ہرگز ممنوع نہیں ہے۔

حاصل کلام

اُبھرتے سورج کی پوجا کرنے والے غالب تہذیب کو ترقّی کی معراج پر سمجھتے ہیں‘ حالانکہ تاریخ گواہ ہے کہ بڑی بڑی تہذیبیں وقت کے ساتھ زوال پذیر ہوئیں اور آج ان کا نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ دنیا میں جتنی بھی تہذیبیں غالب رہیں ان میں زندہ صرف وہ تہذیب رہی جو دوسروں کی نقالی نہیں کرتی تھی۔ جس تہذیب نے اپنا جدید نظام دیا تو وہی اپنا تشخص برقرار رکھ پائی۔ اگر زمانہ بدل رہا ہے تو اس کو مزید بھی بدلا جا سکتا ہے‘ لیکن صرف وقت کے تبدیل ہو جانے کی وجہ سے زندگی کے اصول‘ حق و باطل کے معیار اور خیر و شر کے پیمانے نہیں بدلے جا سکتے۔ اسلامی تہذیب کی بنیاد وحی الٰہی پر رکھی گئی ہے جس کی اقدار اتنی اعلیٰ ہیں کہ ہر دور میں فائدہ مند ہیں‘ جس کا کوئی دوسری تہذیب مقابلہ نہیں کر سکتی۔ وحی اور الہام کی بنیاد پر جو معاشرہ تعمیر ہوتا ہے وہ ان نظاموں اور معاشروں سے مختلف ہوتا ہے جو حواس‘ عقل اور اشراق کی بنیاد پر بنتے ہیں۔ اس لیے مسلم نوجوانوں کو بلا چون و چرا اسلامی تہذیب کو پروان چڑھانا چاہیے اور مغربی تہذیب کو اپنانے سے گریز کرنا چاہیے۔ ❁❁❁

جہاد فی سبیل اللہ

اصل حقیقت‘ اہمیت و لزوم اور مراحل و مدارج

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کا ایک جامع خطاب

اشاعت خاص: 60 روپے اشاعت عام: 30 روپے

ختمِ نبوّت کا ایک تکمیلی پہلو:
ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کا کردار

خواتینِ اسلام کی خصوصی توجّہ کے لیے

انجینئر مختار فاروقی

(گزشتہ سے پیوستہ)

عورتوں کے لیے اِتمامِ حُجّت بذریعہ ازواجِ مُطہّرات

محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اللہ تعالیٰ نے جو متعدد ازواج (plygamy) عطا کیں اس کی حکمت بھی اسی کے ساتھ منسلک ہے کہ آپ ﷺ کے نکاح میں مختلف قبائل اور مختلف مزاج کی خواتین دی گئیں' آپ ﷺ نے ان کی تربیت کی اور ان کے نسوانی مسائل ان کو سمجھائے۔ صاف ظاہر ہے کہ ایک عورت رسول اللہ ﷺ سے جو مسائل بحیثیت شوہر اور بیوی کے سمجھے گی وہ کوئی اور کسی بھی حیثیت سے کسی خاتون کو تعلیم نہیں دے سکتا۔ بھائی اپنی بہن کو' بیٹا اپنی ماں کو اس طرح تعلیم نہیں دے سکتا اور کوئی خاتون اپنے کسی استاد سے اس درجہ میں مسائل نہیں پوچھ سکتی۔ رسول اللہ ﷺ نے ایسے بالکل پوشیدہ مسائل کی تعلیم بھی دی ہے جن میں ہدایت درکار تھی۔ اگر تو کامل ہدایت مطلوب ہے پھر تو ان مسائل میں بھی رہنمائی ضروری ہے۔ یا تو اسلام میں بھی یہ طے کر دیا جاتا کہ یہ موٹی موٹی باتیں تو بس ٹھیک ہیں' باقی نجی معاملات میں جو چلتا رہے کوئی پرواہ نہیں ہے' بس نماز پڑھتے اور تسبیحات کرتے رہو اور جہاد کرتے رہو اتنا کافی ہے' باقی کوئی فرق نہیں پڑتا۔ جیسے آج کی مغربی سوسائٹی ہے اسی طرح کا عرب کا پرانا معاشرہ تھا کہ جہاں ہر طرح کی جنسی بے راہروی (sexual corruption) تھی۔ جب اس کی اصلاح کر دی گئی اور یہ طے کر دیا گیا کہ زندگی کے باریک ترین اور remote گوشوں میں بھی اللہ کی

ہدایت ماننی ہے تو ہر طرح کے مسائل میں تفصیلی ہدایات کی ضرورت تھی۔ جب ہم کہتے ہیں کہ اللہ دیکھ رہا ہے' اللہ ہر وقت ہر جگہ موجود ہے' کوئی شخص اکیلا نہیں ہوتا مگر اُس کے ساتھ دوسرا اللہ ہوتا ہے' دو آدمی نہیں ہوتے کہ تیسرا اُن کے ساتھ اللہ ہوتا ہے' اور حدیث میں بھی ہے کہ ''آدمی اللہ کا تقویٰ اختیار کرے تنہائی میں بھی اور لوگوں کے سامنے بھی'' تو تقویٰ کیسے اختیار کریں؟ لوگوں کے سامنے تقویٰ اختیار کرنا آسان ہے لیکن تنہائی میں اللہ کے احکام کی پیروی اور اللہ کی کسی نافرمانی سے بچنا بہت مشکل کام ہے۔

حضرت محمد ﷺ مسلمان مرد و خواتین کے لیے کامل نمونہ تھے۔ اس کے لیے رسول اللہ ﷺ نے ہر کام کا عملی نمونہ پیش فرمایا ہے' تاہم خالص نسوانی معاملات میں آپؐ سے اس کی توقع ہی نہیں ہو سکتی تھی' آپؐ نے نہ برقع پہن کر دکھایا' نہ دوپٹہ اوڑھ کر دکھایا' بلکہ اسلام کی وہ تعلیمات جو خواتین سے متعلق ہیں ان کی تعلیم کے لیے اللہ تعالیٰ نے وہ خواتین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے عقد میں دیں جو ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن بنیں اور ان کو رسول اللہ ﷺ نے تعلیم دی۔

محمدؐ رسول اللہ ﷺ نے جو تعلیمات اپنی خواتین کو دیں اس کا اللہ تعالیٰ نے دو طریقے پر تحفظ فرمایا ہے۔ اس لیے کہ ہو سکتا ہے کسی ایک وقت کسی کی شاگردی اختیار کر کے کچھ باتیں سیکھ لی جائیں' لیکن آپ سب کو تجربہ ہے کہ آدمی جب درس گاہ سے باہر نکلتا ہے تو دوستوں میں یا گھر بار میں مشغول ہو کر چند دن بعد بھول جاتا ہے' اس سے وہ حق تو ادا نہیں ہوتا' لوگوں کے سامنے تو بات نہیں پہنچتی۔ لہٰذا اللہ تعالیٰ نے دو طریقے پر اس کا تحفظ کیا ہے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی جو تعلیمات اتمامِ حُجّت کے لیے خواتین تک پہنچی ہیں کہیں ان میں گڑبڑ نہ ہو جائے' ان میں کہیں غلط نظریات کی آمیزش نہ ہو جائے۔ تحفظ کی ایک شکل یہ ہے کہ جو خواتین محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے زیرِ عقد آئیں اللہ تعالیٰ نے اُن کی ہر طریقے پر ذہنی و فکری تربیت فرمائی اور اس حوالے سے جو بھی کوئی آلائش کسی ممکنہ درجے میں ہو سکتی تھی اُس سے ان کی تطہیر فرمائی۔ ہمارا تصوّر یہ ہے کہ ''عصمت'' انبیاء کرام علیہم السلام کے لیے تو ثابت ہے' کوئی غیر نبی اس معنی میں گناہوں سے صد فیصد مبرّا نہیں ہو سکتا۔ اور جیسے پہلے عرض کیا گیا کہ انبیاء کی عصمت اور معصومیّت کا مطلب بھی یہی ہے کہ بحیثیت انسان تو اُن کے اندر بھی خطا کا امکان موجود رہتا تھا لیکن چونکہ اُن کی زندگی لوگوں کے لیے نمونہ بننی ہوتی ہے اس لیے اللہ تعالیٰ ان کو بچا لیتا تھا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان محترم خواتین

کے لیے بھی اہتمام فرمایا کہ جو نورِ ہدایت اور تعلیمات محمد رسول اللہ ﷺ نے انہیں دیں ان میں کسی اور قسم کے نظریات اور ذاتی سوچ وفکر اور ذاتی میلانات کا دخل نہ ہو جائے۔ یہ بات سورۃ الاحزاب کی ان آیات میں اللہ تعالیٰ نے تدریجاً سامنے رکھی ہے۔

اس ضمن میں ایک اور پہلو بھی سامنے رکھنا چاہیے۔ محمد ﷺ اللہ کے رسول ہیں‘ اُن سے پہلے بھی اللہ کے نبی اور رسول آئے۔ عام انسان میں اور ایک نبی میں یہ فرق ہے کہ نبی پر وحی آتی تھی اور عام انسان اس سے محروم ہے‘ بلکہ وہ اس بات کا محتاج ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ہدایت جن لوگوں پر اُترتی رہی ہے ان سے وہ راہنمائی حاصل کرے‘ ان کا اتباع کرے۔ لیکن ایک عام انسان اللہ کے ہاں اتنا جواب دہ نہیں ہے‘ وہ تو بہانہ بھی کر سکتا ہے کہ مجھے تو ساری زندگی کسی نے بتایا ہی نہیں۔ اللہ تعالیٰ کے حضور کوئی شخص ایسے کہہ سکتا ہے کہ اے اللہ! میں تو ساری زندگی متلاشی رہا کہ کوئی مجھے ہدایت دے‘ سیدھا راستہ بتائے‘ لیکن مجھے تو کوئی آدمی میسّر ہی نہیں آ سکا۔ اگر وہ واقعتاً سچے دل سے کہہ رہا ہے تو اللہ تعالیٰ کے ہاں یہ ایک معقول عذر ہو سکتا ہے‘ لیکن جس تک ہدایت پہنچ گئی وہ یہ نہیں کہہ سکتا۔ اسی طرح جن کو اللہ نے نبی بنایا‘ رسول بنایا اُن کی زندگی میں بالفرض اِن تعلیمات کے خلاف کوئی بات آ جائے تو اللہ تعالیٰ ان سے تو بہت ناراض ہوگا کہ تمہیں تو براہِ راست میری طرف سے وحی آ رہی تھی‘ میری طرف سے مبشرات آ رہے تھے‘ ہدایت آ رہی تھی‘ تمہیں ہر طریقے پر اللہ کی طرف سے انگلی پکڑ کر چلایا جا رہا تھا‘ اس کے باوجود کوئی کوتاہی کیوں ہوگئی؟

سورۂ بنی اسرائیل مکّی سورۃ ہے اور مکی دور کے اواخر میں نازل ہوئی‘ جس وقت مختلف طریقوں سے رسول اللہ ﷺ پر دباؤ ڈالا جا رہا تھا‘ مختلف سفارتیں آ رہی تھیں کہ آپؐ یہ تبلیغ کرنا اور ہمارے نظریات اور بُتوں کو برا کہنا چھوڑ دیں۔ حتیٰ کہ سورۃ یونس میں آیا ہے: ﴿ائْتِ بِقُرْاٰنٍ غَيْرِ هٰذَآ اَوْ بَدِّلْهُ ؕ﴾ (آیت ۱۵) ’’(اے محمد ﷺ!) اس قرآن کے سوا کوئی دوسرا قرآن لے آئیں یا اس میں کوئی تبدیلی کر دیں‘‘۔ اس کے جواب میں رسول اللہ ﷺ ایک پہاڑ کی مانند ڈٹے ہوئے تھے۔ رسول اللہ ﷺ سے ایسا کوئی امکان نہیں تھا‘ لیکن بفرضِ محال اگر ایسا ہو جائے تو اس کا کیا نتیجہ نکلے گا؟ گویا اہلِ ایمان کو یہ بات سمجھانے کے لیے سورۂ بنی اسرائیل کی یہ آیات بھی اتاریں۔ نیز اس میں سختی کا رُخ کفّار و مشرکین کی طرف ہے کہ تم نے

ہمارے نبی ﷺ سے مداہنت کی کوئی امید لگا رکھی ہے تو یہ تمہاری خام خیالی ہے۔ یہ اسی طرح کی بات ہے جیسے سورۃ الانعام میں اللہ تعالیٰ نے کئی نبیوں کا ذکر فرمایا ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ انبیاء کرام علیہم السلام تو اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ‘ ہدایت یافتہ اور معصوم بندے ہوتے ہیں‘ لیکن آخر میں فرمایا: ﴿وَلَوْ اَشْرَكُوْا لَحَبِطَ عَنْهُمْ مَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ﴾ ’’اگر ان سے بھی (بالفرض) شرک ہو جاتا تو اللہ تعالیٰ ان کے سارے اعمال حبط کر دیتا‘‘۔ انبیاء سے ایسا کوئی امکان نہیں ہے‘ لیکن بات سمجھانے اور منطقی انتہا تک پہنچانے کے لیے فرمایا کہ بفرضِ محال ان برگزیدہ بندوں سے بھی اگر یہ غلطی ہو جائے تو یہ غلطی اتنی بڑی ہے کہ اللہ تعالیٰ معاف نہیں فرمائے گا۔ اسی طریقے پر یہاں بھی بفرضِ محال کے درجے میں بات ہے: ﴿وَلَوْلَآ اَنْ ثَبَّتْنٰكَ لَقَدْ كِدْتَّ تَرْكَنُ اِلَيْهِمْ شَيْـًٔا قَلِيْلًا﴾ ’’(اے نبی ﷺ!) اور اگر ہم آپ کو ثابت قدم نہ رکھتے تو عین ممکن تھا کہ آپ ان کی طرف قدرے قلیل مائل ہو ہی جاتے‘‘۔ آپ کے دل میں شاید کوئی میلان پیدا ہو جاتا۔ یا کم از کم آدمی کبھی یہ سوچنے پر ہی آمادہ ہو سکتا ہے کہ ان کے ساتھ کوئی مفاہمت کر لی جائے تو شاید اس میں کوئی بہتری کے آثار پیدا ہو جائیں۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: ﴿اِذًا لَّاَذَقْنٰكَ ضِعْفَ الْحَيٰوةِ وَضِعْفَ الْمَمَاتِ﴾ ’’(اے نبی ﷺ! بفرضِ محال اگر آپ ان کفّار و مشرکین کے ساتھ ذرّہ برابر بھی آمادۂ مصالحت ہو جاتے) تب ہم آپ کو دنیا کی زندگی میں بھی دوہرے عذاب کا مزا چکھاتے اور مرنے کے بعد بھی دوہرے عذاب کا‘‘ ﴿ثُمَّ لَا تَجِدُ لَكَ عَلَيْنَا نَصِيْرًا﴾ (بنی اسرائیل) ’’پھر آپ ہمارے مقابلے میں کوئی مددگار (فریاد کو پہنچنے والا) نہ پاتے۔‘‘

مطلب یہ ہے کہ بفرضِ محال کے درجے میں اگر ایسا کام رسول اللہ ﷺ سے بھی سرزد ہو جائے تو پھر اللہ کے ہاں معافی نہیں ہے۔ ع ’’جن کے رتبے ہیں سوا اُن کی سوا مشکل ہے!‘‘ —— اللہ کی طرف سے وحی آ رہی ہو‘ ہدایت آ رہی ہو‘ مبشرات آ رہے ہوں‘ تو پھر ذمّہ داری بھی اتنی ہی بڑھ جاتی ہے کہ آدمی اس کا حق ادا کرے‘ اس کے لیے اپنا جان و مال کھپائے۔ جیسے ایک آدمی دین کے بارے میں معلومات نہیں رکھتا تو اللہ کے ہاں اُس کی جواب دہی بھی اسی قدر ہے‘ ایک آدمی تھوڑی سی معلومات رکھتا ہے اس کی جواب دہی اس سے بڑھ کر ہے‘ جب کہ ایک آدمی بہت زیادہ معلومات رکھتا ہے‘ اور ایک آدمی اِتمامی درجہ میں دین کی معلومات رکھتا ہے اور سارے

معاملے کو سمجھتا ہے‘ پھر بھی بدعملی کا مرتکب ہو اور دین کے احکام کی خلاف ورزی کر رہا ہو تو اللہ کے ہاں سخت ناراضگی ہے۔ ﴿كَبُرَ مَقْتًا عِنْدَ اللّٰهِ اَنْ تَقُوْلُوْا مَا لَا تَفْعَلُوْنَ ۝۳﴾ (الصّف) اللہ کو سخت غُصّہ دلانے والی بات ہے کہ آدمی کوئی بات زبان سے کہے‘ علمیت کا تو اظہار کرے پھر اس پر عمل کر کے نہ دکھائے۔

سورۃ الاحزاب کی ان آیات میں محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی ازواج سے خطاب کا یہی انداز ہے۔ اس لیے کہ یہ ازواجِ مُطہّرات یہ اُمّہاتُ المؤمنین جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے عقد میں آئی ہیں ان کی ذِمّہ داریاں بھی عام خواتین جیسی نہیں ہیں‘ کہیں بڑھ کر ہیں‘ بہت زیادہ بڑھ کر ہیں۔ اس لیے کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے عقد میں آئی ہیں تو اللہ نے ان کی تربیت کی ہے‘ ان کو ایک موقع میسّر آیا ہے جس کے نتیجے میں ایک اعلیٰ مقام پر فائز ہو گئی ہیں۔ اب اگر ان سے کوئی غلطی ہوئی تو یہ نہ سمجھیں کہ جیسے کسی اور خاتون سے فروگزاشت ہو جاتی ہے تو اللہ تعالیٰ معاف کر دے گا‘ بلکہ ان کا جرم ایسا بڑا ہوگا کہ اللہ تعالیٰ ان کو عام خواتین سے زیادہ سزا دے گا۔ یہ مفہوم ہے ان آیات کا۔ اگرچہ جس سیاق و سباق (context) میں یہ آیات آ رہی ہیں اس کے لحاظ سے تشریح کے اور پہلو بھی ہیں‘ لیکن میں اس تشریح میں نہیں جا رہا‘ جو گفتگو مَیں نے کی ہے اسی کے حوالے سے ان کا ترجمہ کر رہا ہوں۔

ان آیات کا تاریخی اعتبار سے پس منظر یہ ہے کہ جس سن میں غزوۂ احزاب ہوا اُسی کے قریب یہ آیات اُتری ہیں‘ اور یہ وہ زمانہ ہے کہ جب فتوحات ہونے لگی تھیں‘ جیسے کہ بنونضیر اور بنوقریظہ کے باغات وغیرہ مسلمانوں کے قبضے میں آئے‘ خیبر کا علاقہ فتح ہو گیا‘ بہت سارا مالِ غنیمت مسلمانوں کے پاس آ گیا اور عام مسلمانوں کی مالی حالت قدرے بہتر ہو گئی۔ جب مہاجرین ہجرت کر کے مدینہ آئے تھے اُس وقت پہلے دو تین سال انتہائی کسمپرسی کا حال تھا۔ چند ایک لوگ آسودہ حال تھے‘ جو دوسروں کی مدد بھی کرتے تھے‘ لیکن عمومی اعتبار سے مسلمانوں پر کسمپرسی کا زمانہ تھا۔ جب خیبر اور دوسرے علاقے فتح ہو گئے اور مسلمانوں کے ہاتھ مالِ غنیمت آیا تو عام مسلمانوں کی حالت بھی بہتر ہو گئی۔ ازواجِ مُطہّرات نے بھی رسول اللہ ﷺ سے نان نفقہ بڑھانے کے لیے مطالبہ سا کر دیا۔ ایک حدیث میں آتا ہے کہ رسول اللہ ﷺ اپنے گھر کے لیے سال بھر کا خرچہ نکال دیتے تھے۔ ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کی طرف سے مطالبہ آیا

تو اس پر یہ آیات اُتریں جو ''آیاتِ تخییر'' کہلاتی ہیں کہ ان خواتین کو ایک اختیار (choice) دیا جا رہا ہے۔ اگرچہ ہمارے دین اسلام میں عائلی زندگی کا قانون یہ ہے کہ طلاق کا اختیار مرد کو ہوتا ہے‘ عورت کو تو صرف عدالت کے ذریعے خلع کا اختیار ہے‘ لیکن محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو اپنی خواتین کی طرف سے یہ مطالبہ اچھا نہ لگا‘ لہٰذا ان کے لیے ان آیات میں ہدایت کی گئی کہ اے نبی! آپ اپنی خواتین کو یہ اختیار دے دیجیے کہ اگر تو تمہیں دنیا پسند ہے‘ اچھا status اور اچھا کھانا پینا پسند ہے‘ دسترخوان پر صبح‘ دوپہر‘ شام ایک سے زیادہ کھانے ہوں‘ اچھا لباس ہو اور دنیاوی سہولتیں ہوں‘ اگر یہ پسند ہے تو پھر آؤ مَیں تمہیں رخصت کر دیتا ہوں۔ پھر نبی ﷺ کے گھر میں نہیں رہ سکتیں۔ البتہ اگر تمہیں اللہ‘ اُس کا رسول ﷺ اور آخرت پسند ہے تو اس کے کچھ تقاضے ہیں جو تمہیں ادا کرنے چاہئیں۔ اُس وقت نبی اکرم ﷺ کے عقد میں چار خواتین تھیں۔ چاروں نے اس اختیار کے حوالے سے جو ان آیات میں دیا گیا تھا اپنی آزاد مرضی سے یہی فیصلہ کیا تھا کہ ہم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے عقد میں رہیں گی‘ ہمیں دنیا نہیں چاہیے‘ ہمیں آخرت چاہیے۔ یہ بہت بڑا مقام ہے۔ یہ ہے ان آیات کا تاریخی پس منظر۔ اس میں اس اعتبار سے سارا نقشہ ہے کہ ختم نبوت کا وہ پہلو جس سے عورتوں پر بھی اِتمامِ حُجّت ہو جائے اور جو ذِمّہ داری اللہ تعالیٰ نے ان پر لگائی ہے اس کا بیان ہے۔ فرمایا:

﴿يٰٓاَيُّهَا النَّبِيُّ قُلْ لِّاَزْوَاجِكَ﴾ ''اے نبی (ﷺ)! آپ اپنی ازواج سے کہہ دیجیے''۔ ازواج جمع کا صیغہ ہے‘ مراد ہے کہ تین سے زیادہ خواتین تھیں۔ تاریخی اعتبار سے اُس وقت چار خواتین آپؐ کے زیرِ عقد تھیں۔ آپ اپنی ازواج کو یہ اختیار دے دیجیے ﴿اِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ الْحَيٰوةَ الدُّنْيَا وَزِيْنَتَهَا﴾ ''اگر تم دنیا کی زندگی اور اس کی زینت چاہتی ہو''—— اگر تمہیں دنیا پسند ہے‘ دنیاوی زیب و زینت اور status پسند ہے اور اس زندگی کا اعلیٰ معیار پسند ہے ﴿فَتَعَالَيْنَ اُمَتِّعْكُنَّ وَاُسَرِّحْكُنَّ سَرَاحًا جَمِيْلًا ۝۲۸﴾ ''تو آؤ میں تمہیں کچھ مال و متاع دے کر اچھے طریقے سے رخصت کر دوں''۔ مجھے بتا دو‘ مَیں تمہیں کچھ مال و متاع دے دوں گا لیکن پھر تمہیں گھر سے رخصت کر دوں گا۔ تمہیں دنیا کی زندگی چاہیے تو جاؤ کہیں اور گھر بسا لو۔ ﴿وَاِنْ كُنْتُنَّ تُرِدْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ وَالدَّارَ الْاٰخِرَةَ﴾ ''اور اگر تم اللہ اور اس کے رسولؐ اور آخرت کے گھر کی طالب ہو''—— اگر تم یہ اختیار کر لو کہ ہمیں تو اللہ اور اُس کے

رسول کی رضا چاہیے کہ جو کچھ بھی میسّر ہوگا ٹھیک ہے‘ اگر محمد ﷺ اچھا کھائیں گے تو ہم بھی اچھا کھالیں گے‘ اگر ان کو تنگی تکلیف فاقہ آجائے گا تو ہم بھی فاقہ کرلیں گے‘ گزارا کرلیں گے‘ اگر یہ طرزِ زندگی تمہیں پسند ہے اور آخرت کی زندگی پسند ہے ﴿فَاِنَّ اللّٰهَ اَعَدَّ لِلْمُحْسِنٰتِ مِنْكُنَّ اَجْرًا عَظِيْمًا ﴿۲۹﴾﴾ ’’تو (اطمینان رکھو کہ) اللہ نے تم جیسی نیک خواتین کے لیے اجر عظیم تیار کر رکھا ہے‘‘۔ اس صورت میں دنیا تو جو گزرنی ہے وہ گزر ہی جائے گی‘ لیکن تم میں سے جو بھی یہ فیصلہ کرلیں کہ ہمیں آخرت چاہیے‘ محمد ﷺ کا گھر چاہیے‘ ان کی ہم نشینی چاہیے تو ایسی محسنات کے لیے‘ ایسی احسان کی روش اختیار کرنے والیوں کے لیے‘ ایسی بہتر زندگی اپنے لیے پسند کرنے والیوں کے لیے‘ اللہ تعالیٰ نے بہت بڑا اجر تیار کر رکھا ہے۔

ازواجِ مُطہّرات کا اعلیٰ مقام اور بھاری ذِمّہ داری

اگلی آیت میں وہی انداز ہے جو ابھی مَیں آپ کو سورۃ بنی اسرائیل کی آیت پڑھ کر سنا چکا ہوں کہ اے نبیؐ! بالفرض اگر آپ مداہنت کے متعلق سوچنے پر آمادہ ہو بھی جائیں تو اللہ کی طرف سے جو آپ کا مقام ہے اس کے اعتبار سے یہ بہت بڑی کوتاہی شمار ہوگی اور اللہ تعالیٰ آپ سے سخت ناراض ہوگا۔ معاذ اللہ! امکان نہیں تھا‘ لیکن سمجھانے کے لیے فرمایا۔ یہاں بھی فرمایا: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ مَنْ يَّاْتِ مِنْكُنَّ بِفَاحِشَةٍ مُّبَيِّنَةٍ﴾ ’’اے نبی (ﷺ) کی بیویو! جو کوئی تم میں سے کسی صریح بے حیائی کے کام میں ملوث ہو جائے گی‘‘ —— امکان نہیں ہے اور نہ ہوا‘ اس لیے کہ سورۃ النور میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بات واضح ہو چکی ہے: ﴿اَلْخَبِيْثٰتُ لِلْخَبِيْثِيْنَ وَالْخَبِيْثُوْنَ لِلْخَبِيْثٰتِ ۚ وَالطَّيِّبٰتُ لِلطَّيِّبِيْنَ وَالطَّيِّبُوْنَ لِلطَّيِّبٰتِ ۚ﴾ (آیت:۲۶) کہ یہ جو رشتہ نکاح وجود میں آتا ہے‘ اس میں جو پسند ناپسند کا معاملہ ہوتا ہے اور جو پیغام بھیجے جاتے ہیں اس کے نتیجے میں جو کوئی بات طے ہوتی ہے اس کا ایک معنوی اور اخلاقی اصول ہے‘ وہ اللہ نے بیان فرما دیا کہ ایک پاک سیرت مرد ایک پاک سیرت خاتون کو ہی پسند کرسکتا ہے اور ایک پاک سیرت خاتون ایک پاک سیرت مرد کو ہی پسند کر سکتی ہے‘ جبکہ ایک بے حیا عورت کسی نمازی پرہیزگار اور شریف مرد کو پسند نہیں کرسکتی اور ایک بے حیا اور بدکردار مرد کسی نیک شریف خاتون کو پسند نہیں کرسکتا۔

یہاں فرمایا: اے نبی کی بیویو! تم میں سے کسی سے جذبات میں کوئی spontaneous

غلطی ہوگئی‘ بالفرض اگر کسی بے حیائی کے کام میں ملوث ہوگئی ﴿يُّضٰعَفْ لَهَا الْعَذَابُ ضِعْفَيْنِ ؕ﴾ ’’اُسے دوگنا عذاب دیا جائے گا‘‘۔ اللہ تعالیٰ اُس کی سزا کو دوہرا کر دے گا۔ یہ ایک عام مسلمان خاتون کی غلطی کی طرح نہیں ہوگی‘ تم نبی ﷺ کی بیویاں ہو‘ تم دوسری خواتین کے لیے نمونہ ہو۔ وہی بات جو محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے لیے کہی گئی‘ اس معنی میں وہی مقام ہے یہاں آپؐ کے گھر کی خواتین کا۔ ﴿وَكَانَ ذٰلِكَ عَلَى اللّٰهِ يَسِيْرًا ﴿۳۰﴾﴾ ’’اور یہ بات اللہ کے لیے آسان ہے‘‘۔

﴿وَمَنْ يَّقْنُتْ مِنْكُنَّ لِلّٰهِ وَرَسُوْلِهٖ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ کی بیویو!) تم میں سے جو کوئی اللہ اور اُس کے رسولؐ کی اطاعت اختیار کرے گی‘‘ ان کے احکام کے سامنے سرِتسلیم خم کرے گی۔ ﴿وَتَعْمَلْ صَالِحًا﴾ ’’اور اچھے کام کرے گی‘‘ —— یہ بات وہی ہے کہ صرف زبان سے کسی بات کا اقرار کر لینا اور عمل سے اس کی خلاف ورزی کرتے رہنا‘ نام کا کلمہ پڑھ کر مسلمانوں میں شامل ہو جانا اور عمل کے اعتبار سے پیچھے رہنا‘ نام کے اعتبار سے کسی تنظیم یا جماعت میں شامل ہو جانا اور اس کے تقاضے ادا نہ کرنا‘ یہ ایک ہی بیماری ہے جو مختلف شکلوں میں مختلف ادوار میں ظاہر ہوتی ہے۔ یہاں بھی اللہ تعالیٰ نے اسی کی طرف اشارہ فرمایا کہ نبی مکرم ﷺ کے گھر میں ہونا اور زبان سے کہہ بھی دینا کہ ہاں ٹھیک ہے ہمیں اللہ اور اُس کے رسول پسند ہیں‘ یہ تمہیں آخرت میں نجات نہیں دلا سکتا۔ اچھے کام کرنے پڑیں گے‘ کردار میں تبدیلی لانی پڑے گی‘ اس کا حق ادا کرنا پڑے گا۔ انسان سے غلطی کا امکان باقی رہے گا لیکن ایک کوشش (effort) جو انسان کی طرف سے ہونی چاہیے‘ جو اس کے لیے محنت درکار ہے‘ اگر اس کا فقدان ہے‘ وہ کہیں نظر نہیں آرہی تو پھر اللہ کے ہاں نبی کی بیوی ہونے کی وجہ سے کوئی کریڈٹ نہیں مل سکتا۔ ﴿نُؤْتِهَآ اَجْرَهَا مَرَّتَيْنِ﴾ ’’تو ہم اُسے اجر بھی دوگنا دیں گے‘‘۔ یہ تو مقام کی بات ہے۔ نافرمانی کروگی تو سزا بھی سخت ہے اور اگر اچھے کام کروگی‘ اس مشکل کو نبھا جاؤ گی تو اجر بھی زیادہ ہے۔

آگے آرہا ہے ازواجِ مُطہّرات کے لیے کہ تم عام خواتین کی طرح نہیں ہو‘ محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے بعد تم نکاحِ ثانی نہیں کرسکتیں۔ جب رسول اللہ ﷺ کی وفات ہوئی ہے تو ایک اعتبار سے حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا کی بہت کم عمر تھی‘ زیادہ سے زیادہ ستائیس‘ اٹھائیس سال کی

ہوں گی‘ لیکن ان کی وفات ہوئی ہے جا کر سن ۵۸ ہجری میں۔ ۱۱ ہجری میں رسول اللہ ﷺ کا وصال ہے‘ ۵۸ ہجری میں جا کر حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا فوت ہو رہی ہیں۔ کوئی اور خاتون ہو تو نکاحِ ثانی کر سکتی ہے۔ ہمارے معاشرے میں تو عجیب لگتا ہے‘ عرب کے معاشرے میں تو کوئی عجیب نہیں تھا۔ وہاں تو کوئی عورت بیوہ ہوئی تو عدّت کی مدّت گزارنے کے بعد نیا نکاح کر لیا۔ تو اللہ تعالیٰ نے ان خواتین پر اگر ایک طرف یہ بوجھ ڈالا ہے تو دوسری طرف اجر بھی زیادہ کر دیا کہ یہ پابندیاں برداشت کر لو تو اللہ کے ہاں بڑا اجر ہے۔ صاف ظاہر ہے کہ جتنی کسی کی محنت اور کوشش ہو‘ جتنی تکالیف کسی نے کسی کام میں اٹھائی ہوں گی اتنا ہی اللہ کے ہاں اس کا اجر ہے۔ ﴿وَاَعْتَدْنَا لَهَا رِزْقًا كَرِيْمًا ﴿۳۱﴾﴾ ’’اور اُس کے لیے ہم نے عزت والا رزق تیار کر رکھا ہے‘‘۔ اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ ہم نے اُس خاتون کے لیے جو ان باتوں پر پوری اتر جائے گی‘ ایک عزّت کی روزی‘ بہت ہی اعلیٰ مقام‘ آخرت میں بہت ہی اعلیٰ درجہ تیار کر رکھا ہے۔

اگرچہ بات واضح ہو چکی تھی لیکن اللہ تعالیٰ نے مختلف اسلوب سے اس کو دہرایا ہے کہ اگر اب بھی بات کہیں گنجلک رہ گئی ہے تو لگی لپٹی رکھے بغیر بالکل سیدھی بات یہ ہے: ﴿يٰنِسَآءَ النَّبِيِّ لَسْتُنَّ كَاَحَدٍ مِّنَ النِّسَآءِ﴾ ’’اے نبیؐ کی بیویو! تم عام عورتوں کی طرح کی عورتیں نہیں ہو‘‘ —— اب رسول اللہ ﷺ کے گھر میں آ کر اور پھر اس آیت تخییر کے حوالے سے اس بات کو اپنے اختیار (choice) اور آزاد مرضی سے حاصل کر کے کہ ہم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے گھر میں ہی رہنا چاہتی ہیں‘ اب تم عام عورتوں کی طرح نہیں رہیں۔ ﴿اِنِ اتَّقَيْتُنَّ﴾ ’’اگر تم تقویٰ اختیار کرو‘‘ —— اگر تمہیں اس بات کا احساس ہو تو تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تمہیں اپنے مقام کو پہچاننا چاہیے‘ اپنی اس اعلیٰ حیثیت کو پہچاننا چاہیے‘ تمہیں دیکھنا چاہیے کہ رہتی دنیا تک تا قیامت تمہارا ایک مقام ہے جو اللہ تعالیٰ نے تمہیں عطا فرما دیا ہے۔ محمد ﷺ کے گھر میں ہونا‘ محمد ﷺ کی بیوی ہونا اتنا اعلیٰ مقام ہے کہ رہتی دنیا تک کے لیے تم نمونہ بن گئی ہو‘ تم اُمّت کی عورتوں کے لیے اُسوہ بن گئی ہو۔ جیسے علامہ اقبال نے کہا ہے: ع ’’مادراں را اسوۂ کامل بتولؓ‘‘ —— صاف ظاہر ہے اگر کوئی نمونہ پکڑا جائے گا تو کہاں سے پکڑا جائے گا؟ کسی بچی کے لیے نمونہ ہو گا تو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کا نمونہ ہو گا اور کسی شادی شدہ خاتون کے لیے نمونہ پکڑا جائے گا تو حضرت عائشہ‘ حضرت حفصہ‘ حضرت زینب‘ حضرت سودہ‘ حضرت اُمّ حبیبہ اور حضرت

خدیجہ رضی اللہ عنہن سے نمونہ پکڑا جائے گا۔ تو فرمایا: اے نبی کی بیویو! تم دوسری عورتوں کی مانند نہیں ہو!

اب آگے چار باتیں فرمائی جا رہی ہیں۔ اور یہ بھی سمجھ لیں کہ یہ اُمّہات المومنینؓ اُمّت کی خواتین کے لیے نمونہ بنائی جا رہی ہیں تو کہیں کوئی نمونہ صرف model کے لیے تو نہیں ہوتا‘ بلکہ لوگوں کو اس کی اِتباع بھی کرنی چاہیے۔ بعد کی خواتین میں سے کسی مسلم خاتون کے لیے جو نمونہ ہو سکتا ہے وہ حضرت محمد ﷺ کی ان ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کا طرزِ زندگی ہے‘ کہیں اور سے نمونہ نہیں مل سکتا۔ اپنی عفت و عصمت کی حفاظت‘ خیالات کی حفاظت‘ نظریات کی حفاظت‘ اپنی شرم گاہوں کی حفاظت مطلوب ہے تو صرف عاصمہ نام رکھ لینے سے انسان نہیں بچ سکتا‘ جب تک اس کے پیچھے جذبہ نہ ہو‘ اس کی سوچ نہ ہو‘ آدمی کے اندر خوفِ خدا اور تقویٰ نہ ہو‘ وہ چاہے مرد ہو چاہے عورت ہو۔ تو اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ اے نبی ﷺ کی بیویو! اگر تم اپنے مقام اور مرتبے کا احساس کرو تو چار باتیں قابل لحاظ ہیں جو آگے فرمائی جا رہی ہیں۔ اور یہ آج کی خواتین کے لیے بھی صد فیصد (بلکہ جسے محاورے میں کہتے ہیں hundred and one precent) آج بھی اسی طرح لاگو ہیں۔

سب سے پہلی بات یہ کہ اگر کسی مرد سے بات کرنی پڑے۔ کسی عورت کو کبھی کسی غیر مرد کے ساتھ بات کرنا پڑ سکتی ہے‘ کوئی مہمان ہو سکتا ہے‘ کوئی دروازے پر آ سکتا ہے‘ بازار جانا پڑ سکتا ہے‘ ڈاکٹر کے پاس جانا پڑ سکتا ہے اور تمام احتیاطوں اور ہر شر سے بچنے کے باوجود کہیں نہ کہیں گفتگو کرنی پڑ ہی جائے گی ﴿فَلَا تَخْضَعْنَ بِالْقَوْلِ﴾ ’’تو گفتگو میں نرمی پیدا نہ کرو‘‘ لجاجت کے انداز میں‘ دب کر گفتگو نہیں کرنی چاہیے۔ بہت بڑی بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج کے دور میں آدمی اسے اپنے آپ پر طاری کر کے دیکھے۔ دراصل تمام مسلمان خواتین کو خطاب ہے کہ تمہیں کسی مرد کے ساتھ بات کرنی ہو تو لوچ دار انداز میں‘ محبّت کے انداز میں‘ دبے ہوئے انداز میں بات نہیں کرنی چاہیے۔ ﴿فَيَطْمَعَ الَّذِيْ فِيْ قَلْبِهٖ مَرَضٌ﴾ ’’کہ وہ شخص جس کے دل میں روگ ہے وہ کسی لالچ میں پڑ جائے گا‘‘ —— نبی ﷺ کی بیویوں سے خطاب ہے‘ ان کے دل میں تو کسی غلط بات کا کوئی اندیشہ ممکن نہیں ہے‘ فرض کر لیں اگر بعد کی کوئی عورت بات کر رہی ہے اور اُس کے دل میں کوئی اندیشہ نہیں ہے‘ لیکن جس مرد سے بات ہو رہی ہے اس کی تو کوئی گارنٹی نہیں ہے۔ تو ایسا نہ ہو کہ تم دب کر بات کرو تو پھر لالچ کرے وہ شخص جس کے دل

میں کوئی بیماری ہے‘ جسے خدا خوفی نہیں ہے‘ اُس کے دل میں ایسے خیالات آ جائیں‘ اس طرف اس کا میلان ہو جائے۔ ایک درجے میں تو ایسا خیال ہر آدمی کو آ سکتا ہے‘ جو بہر حال ایک خاص حد تک قابلِ برداشت (tolerable) ہے اور اس سے صرفِ نظر کیا جا سکتا ہے‘ لیکن یہ خاص حد سے آگے بڑھ جائے تو کوئی شر بھی پیدا ہو سکتا ہے۔ اگر نرمی سے بات نہ کی جائے تو اس شر کے پیدا ہونے کا امکان کم سے کم رہے گا۔ لیکن اگر نرم اور لوچ دار انداز میں بات کی جائے تو جس کے دل میں خیال نہ بھی ہو تو پیدا ہو جائے گا۔ لہٰذا پہلا حکم دیا جا رہا ہے کہ اے نبی کی بیویو! اگر کسی مرد سے بات کرنی ہو تو لجاجت کے انداز میں بات نہیں کرنی۔ کہیں ایسا نہ ہو کہ کسی کے دل میں کوئی روگ ہو‘ کوئی شر ہو‘ کوئی جنسی میلان ہو اور وہ بھڑک اٹھے اور بات آگے بڑھ جائے۔

﴿وَ قُلْنَ قَوْلًا مَّعْرُوْفًا ۝۳۲﴾ ’’اور (اے نبیؐ کی بیویو!) تم معروف طریقے پر بات کیا کرو!‘‘ بس معقول اور معروف انداز میں صرف ضرورت کی بات چیت کرنی چاہیے۔ یہ بات دراصل وہی ہے جو میں نے پہلے کہی ہے۔ قرآن مجید میں کئی مقامات پر محمدؐ رسول اللہ ﷺ کو مخاطب کر کے اُمّت کو خطاب کیا گیا ہے اور اس میں بعض جگہ پر سخت انداز بھی ہے‘ لیکن مقصود اُمّت کو سمجھانا ہے۔ اسی طرح نبی ﷺ کی بیویوں سے اس بات کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا‘ لیکن اُمّت کی مسلمان خواتین جن کے لیے نمونہ بنانا مقصود ہے ان کو احکام دیے جا رہے ہیں۔

﴿وَقَرْنَ فِیْ بُیُوْتِکُنَّ﴾ ’’(اے نبی ﷺ کی بیویو!) تم اپنے گھروں میں قرار پکڑو‘‘۔ یہ تیسرا حکم ہے۔ مسلمان خاتون کا اصل مقام اُس کا گھر ہے۔ ایمرجنسی ہو سکتی ہے‘ جو مختلف درجوں میں ہو سکتی ہے۔ جو خاتون بالکل خاتونِ خانہ ہے‘ گھر سے باہر کوئی کام جاب وغیرہ نہیں کرتی اُسے بھی کبھی اپنے شوہر کی غیر موجودگی میں ڈاکٹر کے پاس یا اور کہیں جانا پڑ سکتا ہے‘ کسی سے گفتگو کرنی پڑ سکتی ہے‘ تو فرمایا جا رہا ہے کہ وہ اسے صرف ایمرجنسی سمجھے کہ مَیں اس خاص حالت کی وجہ سے اس حکم سے تجاوز کر کے باہر جا رہی ہوں۔ اصل مقام جو خاتون کا ہے وہ اُس کا گھر ہے۔ فارغ وقت بھی ہو تو کسی معقول وجہ کے بغیر سیر سپاٹا کا شوق‘ شاپنگ یا اور کسی وجہ سے یا بلا وجہ ہی گھر سے باہر جا رہی ہے تو یہ کسی باعمل باکردار مسلمان خاتون کا شیوہ نہیں ہو سکتا۔

﴿وَلَا تَبَرَّجْنَ تَبَرُّجَ الْجَاهِلِيَّةِ الْأُوْلٰى﴾ ’’اور مت نکلو بن سنور کر پہلے دورِ

جاہلیت کی طرح‘‘ —— نبی ﷺ کی بیویوں سے اور ان کو مخاطب کر کے عام مسلمان خواتین سے خطاب ہے کہ اپنی زیب و زینت دکھلاتی نہ پھرو جیسا کہ اسلام سے پہلے دکھلاتی پھرتی تھیں۔ یا ایسے بھی ترجمہ ہو سکتا ہے کہ جو خواتین اسلام نہیں لائیں جیسے وہ اپنی زیب و زینت دکھاتی پھرتی ہیں‘ ان کا فیشن‘ کپڑوں کا انداز‘ زیورات کا انداز‘ چلنے کا انداز اور بات چیت کا انداز مت اختیار کرو۔ فرمایا گیا کہ اے نبی ﷺ کی بیویو! تمہیں زیب نہیں دیتا کہ اس انداز سے بن سنور کر باہر نکلو۔ بروج کہتے ہیں نمایاں جگہ کو۔ اب کوئی خاتون ایسی ہو سکتی ہے کہ اُس نے برقع پہنا ہوا ہے‘ لیکن وہ ایسے عجیب ڈیزائن کا یا ایسے glamour والے کپڑے کا پہنا ہوا ہے کہ بازار میں نظر اُسی کی طرف جا رہی ہے۔ تو معلوم ہوا کہ اس برقع کے پہننے کا بھی کوئی فائدہ نہیں کہ نمایاں تو ہو گئی جو ہونی نہیں چاہیے تھی۔ چنانچہ فرمایا کہ تم اپنے آپ کو ظاہر نہ کرو‘ نمایاں نہ کرو‘ دکھلاتی نہ پھرو‘ جیسا کہ جاہلیت کے دور میں یہی خواتین جو اسلام سے پہلے تھیں وہ دکھلاتی پھرتی تھیں‘ یا جاہلیت کی خواتین جو اسلام سے باہر ہیں وہ اب بھی دکھلاتی پھرتی ہیں۔

پہلے چار احکام تو منفی تھے‘ کہ یہ نہ کرو‘ یہ نہ کرو! اب آگے مثبت احکام ہیں کہ تمہیں یہ یہ کرنا ہے۔ نبی اکرم ﷺ کی ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن سے ان احکام کی خلاف ورزی کا امکان نہیں تھا۔ تو ان کی وساطت سے تمام مسلمان خواتین کو مخاطب کر کے یہ بات کہی جا رہی ہے: ﴿وَاَقِمْنَ الصَّلٰوةَ﴾ ’’اور نماز قائم کرو‘‘ —— اے مسلمان خواتین (بظاہر خطاب ہے ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ﴾ اے نبی کی بیویو!) تم نماز قائم کرو۔ ایک نماز کا پڑھنا ہے اور ایک نماز کا قائم کرنا ہے‘ دونوں میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ نماز کا پڑھنا اور ہے‘ آدمی کو جب نماز کے لیے وقت لگا تو رکوع سجدہ کیا اور فارغ ہوا تو بس سمجھو کہ نماز ادا ہو گئی۔ باقی اس نماز کا پہلے کوئی اثر تھا نہ بعد میں کوئی اثر ہوا۔ یہ نماز قائم کرنا نہیں ہے۔ نماز کا قائم کرنا تو یہ ہے کہ آدمی پوری زندگی اللہ اور اس کے رسول ﷺ کی اطاعت میں دے دے‘ اور اسی میں وقت نکال کر اپنی یاددہانی کے لیے‘ اپنی بیٹری چارج کرنے کے لیے‘ اپنے جذبے اور اپنے احساسات کو بیدار کرنے کے لیے نماز میں آئے اور محسوس کرے کہ واقعتاً اگر کوئی غفلت طاری ہو گئی تھی تو اب دوبارہ میرا شعور بیدار ہو گیا ہے۔ پھر آدمی کام پر نکل جائے۔ اگر یہ احساس ہو گا تو یہ نماز کو قائم کرنا ہے۔ ﴿وَاٰتِیْنَ الزَّكٰوةَ﴾ ’’اور زکوٰۃ ادا کرتی رہو‘‘۔ ﴿وَاَطِعْنَ اللّٰهَ وَرَسُوْلَهٗ ؕ﴾ ’’اور (اے نبی ﷺ

کی بیویو!) اللہ اور اُس کے رسول (صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم) کی اطاعت کرتی رہو‘‘۔ ضمنی طور پر پھر وہی مضمون ہے جو پہلے آچکا ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے گھر میں ہونا تمہیں کوئی کریڈٹ نہیں دلا سکتا۔ آج کی مسلمان خاتون کے لیے کہا جا سکتا ہے کہ نام کا مسلمان ہو جانا یا مسلمان شوہر کے گھر میں ہونا‘ کسی خاتون یا کسی مرد کا مسلمان نام رکھ لینا فائدہ نہیں پہنچا سکتا جب تک کہ اس کا عمل اور کردار اس کے ساتھ گواہی نہ دے۔

اگلی بات جس کی طرف پہلے بھی اشارہ کیا جا چکا ہے یہ ہے کہ ختمِ نبوّت کا یہ تکمیلی پہلو جو اللہ تعالیٰ نے خواتین کو ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کے ذریعے ایک اُسوہ اور نمونہ عطا فرمایا ہے‘ اس کی پھر اللہ نے حفاظت کی ہے‘ جو تعلیمات محمد صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے دی ہیں ان کو حاصل کرنے کے لیے بھی تو ایک اطاعت کرنے والا اور سرِ تسلیم خم کرنے والا ذہن چاہیے‘ بُرے نظریات اور برے خیالات سے پاک صاف ایک ذہن چاہیے۔

اللہ تعالیٰ کی جانب سے ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کی تطہیر

آگے فرمایا: ﴿اِنَّمَا یُرِیۡدُ اللّٰہُ لِیُذۡہِبَ عَنۡکُمُ الرِّجۡسَ اَہۡلَ الۡبَیۡتِ وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ﴿۳۳﴾﴾ ’’اللہ تو بس یہی چاہتا ہے اے نبیؐ کے گھر والو! کہ وہ دور کر دے تم سے ناپاکی اور تمہیں خوب اچھی طرح پاک کر دے‘‘۔ اہل بیت سے اصلاً مراد نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویاں ہی ہیں۔ انہی سے خطاب ہو رہا ہے: ﴿یٰنِسَآءَ النَّبِیِّ﴾۔ قرآن مجید میں اور مقامات پر بھی اسی طرح ذکر ہے۔ اصلاً کسی کے اہل بیت اُس کی بیویاں کہلاتی ہیں‘ ہاں اولاد اس کے تابع ہوتی ہے کہ وہ بھی گھر والے ہیں‘ لیکن اصلاً اس سے مراد خواتین ہیں۔ یہاں بہرحال اندازِ گفتگو یہی ہے کہ اہلِ بیت سے مراد نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ازواجِ مُطہّرات ہیں‘ جو ہمارے لیے اُمّہات المومنین رضی اللہ عنہن ہیں۔

ارشاد ہوا کہ بے شک اللہ تعالیٰ تو یہ چاہتا ہے کہ جو کوئی بھی خرابی سوچ اور نظریات میں اسلام کے دور سے پہلے کی کوئی بات لگی ہو اُس کو دور کر دے۔ اور ہم اس کا صحیح تصور نہیں کر سکتے‘ مَیں اور آپ مسلمان ہیں‘ ہم مسلمان گھر میں پیدا ہوئے ہیں‘ ہم بچپن سے ان خیالات سے واقف ہیں کہ یہ قرآن ہے‘ یہ نماز ہے‘ یہ روزہ ہے‘ یہ دین کی باتیں ہیں۔ اگر کوئی عمل نہیں کرتا تب بھی ذہن میں کچھ تصوّرات چپکے ہوئے ہوتے ہیں کہ دین کا یہ تصوّر ہے۔ لیکن صاف ظاہر ہے

کہ محمدؐ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے دور سے پہلے کا زمانہ ایک مشرکانہ دور تھا‘ اس میں جو نظریات ہو سکتے تھے‘ جو سوچ ہو سکتی تھی‘ اس سے اگر کسی درجے میں تقابل کیا جا سکتا ہے تو آج کے دور میں اگر کوئی شخص مغربی سوسائٹی سے نکل کر مسلمان ہو جائے تو اُس کے سابقہ خیالات اور اسلام لانے کے بعد کا دور کسی درجے میں آپس میں موافق (compatiable) نہیں ہوتے۔ کوئی آدمی چالیس سال کی عمر میں مسلمان ہو جائے یا آج بھی کوئی غیر مسلم مسلمان ہو جائے تو اُس کی سابقہ سوچ‘ مشاہدات‘ لوگوں کے ساتھ میل جول کے نتیجے میں جو تاثرات و تجربات ہیں وہ ذہن سے بالکلیہ محو تو نہیں ہو سکتے‘ کبھی کبھی آدمی سوچتا ہے تو ان کے اثرات بھی ذہن میں سوچ کے ساتھ آجاتے ہیں۔

تو اللہ تعالیٰ نے ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کے بارے میں فرمایا کہ اسلام لانے سے پہلے کے دَور کی کوئی ذہنی اور فکری باتوں میں بھی اگر کوئی ایسا عنصر موجود ہے تو اللہ تعالیٰ چاہتا ہے کہ اس کو دُور کر دے‘ تاکہ اے نبی کی بیویو! نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے جو تعلیمات تمہیں دی ہیں‘ جو قرآن پہنچایا ہے‘ اللہ کی طرف سے جو ہدایت تمہیں عطا فرمائی ہے‘ وہ خالص اور اپنی اصلی حالت میں اُمّت تک پہنچا سکو۔ ﴿وَیُطَہِّرَکُمۡ تَطۡہِیۡرًا ۝﴾ اور تمہیں پاک صاف کر دے کردار کے اعتبار سے‘ جیسے پاک صاف کرنے کا حق ہے۔ یہ اس لیے کہ اُمّہات المومنین کو قیامت تک کی خواتین کے لیے نمونہ بننا ہے۔ اگر وہاں خدانخواستہ کوئی غلط بات ہو گئی تو پھر قیامت تک خواتین کے لیے غلط اسوہ قائم ہو جائے گا۔ چنانچہ اللہ تعالیٰ نے فرمایا: اے نبی کی بیویو! ہم تمہیں بالکل پاک صاف کر دینا چاہتے ہیں۔ عصمت انبیاء تو نبیوں کا خاصّہ ہے‘ لیکن غیر نبی کے لیے جتنا بھی اعلیٰ درجہ ممکن ہے خیالات کی تطہیر کا‘ پاکیزگی کا‘ تصفیہ قلب کا‘ تجلیۂ باطن کا وہ اعلیٰ ترین درجے میں اللہ نے گارنٹی کیا ہے ان خواتین اُمّہات المومنینؓ ازواج النبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے لیے۔

(ایک ضمنی بات جو کہ اس گفتگو کا موضوع نہیں‘ یہ ہے کہ یہیں سے وہ تصوّر بنا ہے جس میں ’’اہل بیت‘‘ کا مفہوم بدل دیا گیا ہے کہ اہل بیت میں ازواجِ مُطہّرات شامل نہیں ہیں۔ اس لیے کہ ایک خاص گروہ کو حضرت ابوبکر اور حضرت عمر رضی اللہ عنہما سے دشمنی ہے۔ حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کی بیٹی عائشہ رضی اللہ عنہا ہیں اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا ہیں‘ تو ان سے ان کی دشمنی ہے۔ اس لیے ازواجِ مُطہّرات کو وہ ’’اہل بیت‘‘ میں شمار ہی نہیں کرتے۔ لہٰذا ’’اہل بیت‘‘ کے تصوّر میں سے نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی بیویوں کو نکال دیا گیا اور کچھ مزید ہستیوں کو اس میں شامل کر دیا گیا —— وہ

بھی ہمارے نزدیک محترم ہیں‘ لیکن اس آیت کا مصداق نہیں ہیں۔ اور پھر ﴿وَيُطَهِّرَكُمْ تَطْهِيْرًا﴾ کے نتیجے میں وہ ’’پنجتن پاک‘‘ کا تصوّر سامنے لایا گیا۔ گویا ؎

خشتِ اوّل چوں نہد معمار کج
تا ثریّا می رود دیوار کج!

والا معاملہ ہو گیا کہ ایک غلط سوچ کے نتیجے میں پہلے تھوڑی سی غلطی ہوئی‘ اب اس کا منطقی نتیجہ نکالنا پڑا‘ پھر تصوّر ہی بالکل بدل گیا۔ اور قرآن مجید کے لیے ایک بالکل اجنبی تصوّر (foreign concept) اور ایک بالکل متضاد تصوّر (contrary concept) نکال کر لے آئے کہ یہ ’’پنجتن پاک‘‘ ہیں۔ اور صاف ظاہر ہے کہ یہ ایک فارسی اصطلاح ہے‘ قرآن مجید میں تو خیر کیا اس کا ذکر یا اشارہ ملے گا‘ عربی میں کوئی اصطلاح موجود نہیں ہے جو اس کے قریب ہو‘ لیکن وہ تصوّر اسی آیت سے نکالا گیا ہے۔ ضمنی طور پر اپنے ذہن میں کہیں associate کر لیجیے کہ اسی آیت کو بنیاد بنا کر یہ تصوّر اس دنیا میں نکالا گیا ہے۔)

آخری آیت اس سلسلہ کی یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی بیویوں کو مخاطب کر کے یہ کہا جا رہا ہے کہ اے نبی ﷺ کی بیویو! ﴿وَاذْكُرْنَ مَا يُتْلٰى فِيْ بُيُوْتِكُنَّ مِنْ اٰيٰتِ اللّٰهِ وَالْحِكْمَةِ ؕ﴾ ’’اور یاد کیا کرو جو تمہارے گھروں میں اللہ کی آیات تلاوت کی جاتی ہیں اور حکمت کی باتیں (سنائی جاتی ہیں)‘‘۔ ’’وَاذْكُرْنَ‘‘ کے دو مفہوم ہو سکتے ہیں‘ ایک تو یہ کہ یاد کرو جو کچھ تمہارے ان گھروں میں اللہ کی تعلیمات‘ اللہ کی آیات اور حکمت میں سے پڑھا اور سنا جا رہا ہے۔ صاف ظاہر ہے ان گھروں میں وحی بھی اُترتی تھی‘ اس کا تذکرہ بھی ہوتا تھا۔ تو جو کچھ پڑھا یا جا رہا ہے‘ سنایا جا رہا ہے‘ محمد ﷺ پہنچا رہے ہیں تم تک اور دوسروں تک بھی پہنچ رہا ہے اس کا ذکر کرو‘ اس کو یاد رکھو۔ اور دوسرے یہ کہ اس کو پھیلاؤ۔ دونوں مفہوم اس میں ہو سکتے ہیں۔ ﴿اِنَّ اللّٰهَ كَانَ لَطِيْفًا خَبِيْرًا ۝۳۴﴾ ’’بے شک اللہ تعالیٰ بہت باریک بین‘ ہر چیز سے باخبر ہے‘‘۔ ایسا نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ صرف موٹی موٹی باتوں کو جانتا ہے‘ باریک باتوں کو نہیں جانتا‘ بلکہ اللہ تعالیٰ تو انسان کے خیالات اور سوچ سے بھی باخبر ہے اور اس سوچ میں ذرا سی کمی بیشی ہوتی ہے تو اس کو بھی جانتا ہے۔ نبی ﷺ کی ازواج کو مخاطب کر کے کہا جا رہا ہے کہ اللہ تعالیٰ تمہاری باتوں سے اور جو تم فیصلے کرتے ہو اور تمہارے سینوں میں پوشیدہ باتیں جو کسی کو معلوم نہیں

ہوتیں ان سے بھی باخبر ہے۔

تو یہ سورۃ الاحزاب کی آیات ۲۸ تا ۳۴ میں ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کا ذکر ہے اور ان کو گویا ایک نمونے کے طور پر مسلمان خواتین کے لیے پیش کیا جا رہا ہے۔ اور جیسا کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ یہ ختم نبوت کا ایک تکمیلی پہلو ہے۔ اصولاً یہی کہا جائے گا کہ محمدؐ رسول اللہ ﷺ اللہ کے آخری نبی و رسول ہیں‘ وہ مسلمانوں کے لیے اُسوۂ کامل ہیں ﴿لَقَدْ كَانَ لَكُمْ فِيْ رَسُوْلِ اللّٰهِ اُسْوَةٌ حَسَنَةٌ﴾ اسی سورۃ (آیت ۲۱) میں آیا ہے۔ لیکن اس میں ایک قدم اور نیچے اتریں گے تو ایک مرد کا اُسوہ خواتین کے لیے کامل نہیں ہو سکتا‘ خاص طور پر ان مسائل و معاملات میں جو خواتین کے ساتھ خاص ہیں‘ اس میں اللہ تعالیٰ نے محمدؐ رسول اللہ ﷺ کے اُسوہ کو supplement کیا اور اس کی تکمیل کرنے کے لیے ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کی شکل میں خواتین عطا فرمائیں۔ ان کی اللہ نے تطہیر کی ہے‘ ان کی تربیت رسول اللہ ﷺ نے خود بہترین انداز میں کی ہے اور ان کو پھر نمونے کے طور پر مسلمان خواتین کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے۔

یہ جو تعلیمات رسول اللہ ﷺ نے خواتین کو دی تھیں اس کا ایک تحفظ تو ’’تطہیر‘‘ کی شکل میں کیا گیا کہ ان میں کوئی سابقہ تجربات اور دورِ جاہلیت کی کوئی بات اثر انداز نہ ہو جائے۔ اور دوسرا یہ کہ عام خاتون کے لیے اجازت ہے کہ عدت گزر جائے تو نکاحِ ثانی کر لے‘ لیکن ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن کو چونکہ نمونہ بننا تھا لہٰذا ان پر ایک بہت بڑی پابندی لگا دی گئی۔ عام حالات میں ترغیب دی گئی ہے کہ جو بیوائیں ہوں ان کا نکاحِ ثانی کر دیا کرو‘ اس لیے کہ بہرحال انسان کے اندر شادی کا ایک جذبہ ہے‘ مرد ہو یا عورت‘ وہ اس کو برداشت نہیں کر سکتا۔ تو کجا یہ کہ وہ کسی غلط راستے سے تسکین کا طریقہ اختیار کرے اللہ تعالیٰ نے اس کے لیے جائز راستہ رکھا ہے۔ لیکن اُمہات المؤمنین رضی اللہ عنہن کو اللہ تعالیٰ نے جو اعلیٰ مقام عطا فرمایا ہے اس کا ایک منطقی نتیجہ تھا کہ ان کے لیے فرما دیا گیا کہ اے مسلمانو! تم محمدؐ رسول اللہ ﷺ کی بیویوں کے ساتھ کبھی بھی نکاح نہیں کر سکتے‘ یہ تمہاری مائیں ہیں۔ اس میں حکمت یہ ہے کہ انہیں جو تعلیمات محمد ﷺ نے دی ہیں‘ صاف ظاہر ہے ان خواتین نے اپنے فرضِ منصبی کے اعتبار سے خواتین ہی کو تعلیم دینی ہے‘ مرد تو رسول اللہ ﷺ سے تعلیم حاصل کر رہے ہیں۔ لہٰذا ان تعلیمات کو اپنی خالص شکل (pure form) میں رکھنے کے لیے ازواجِ مُطہّرات رضی اللہ عنہن پر نکاحِ ثانی کی پابندی لگا دی گئی۔

اور جیسے کہ میں نے پہلے عرض کیا کہ واقعتاً یہ مشکل کام تھا۔ حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد بھی ۴۷ سال حیات رہی ہیں‘ انہوں نے بہرحال اس منصب کو نبھایا ہے اور اس کا حق ادا کیا ہے۔ یہ ختم نبوت کا تکمیلی پہلو جو خواتین کے اعتبار سے ہے اس کو بھی سمجھنا چاہیے کہ یہ بھی رسولِ اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا اُسوہ ہے جو خواتین کی شکل میں خواتین کو اللہ تعالیٰ نے عطا فرما دیا ہے۔

دوسری بات یہ ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بعد جو خلافت راشدہ کا دور آیا اس میں قرآن وحدیث اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی تعلیمات سے مسائل کا استنباط کرنا تھا۔ صاف ظاہر ہے کہ وہ دور تو ختم نبوت کے نتیجے میں آنا ہی تھا۔ تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے وصال کے بعد سب سے پہلے دور کو حُجّت قرار دے دیا گیا جو نیا نیا تھا۔ اس میں حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے تربیت یافتہ لوگ موجود تھے۔ جس طرح دین کی باتیں انہوں نے محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سمجھی تھیں وہ ابھی تازہ تھیں‘ اصول تازہ تھے‘ تعلیمات تازہ تھیں‘ تو انہوں نے قرآن وحدیث کو مدِّنظر رکھ کر جو مسائل نکالے‘ استنباط کیا‘ وہ باقی دنیا کے لیے حُجّت ہے۔ ازروئے حدیثِ نبویؐ:

((عَلَیْکُمْ بِسُنَّتِیْ وَ سُنَّۃِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِیْنَ الْمَھْدِیِّیْنَ))

تو یہ ختمِ نبوّت کے دو تکمیلی پہلو ہیں جو آج کی اس نشست میں مَیں نے آپ کے سامنے رکھنے کی کوشش کی ہے۔ اللہ کرے کہ میں اس میں کامیاب ہوا ہوں۔

بَارَکَ اللّٰہُ لِیْ وَلَکُمْ فِی الْقُرْآنِ الْعَظِیْمِ وَنَفَعَنِیْ وَاِیَّاکُمْ بِالْاٰیَاتِ وَالذِّکْرِ الْحَکِیْمِ

❁❁❁

آسمانی ہدایت میں مَردوں اور عورتوں کی ذِمّہ داریاں اور میدانِ عمل جدا جدا ہیں۔ تاہم مَردوں کی دینی ذِمّہ داریوں سے خواتین کو آگاہی ہونی چاہیے‘ تاکہ وہ گھر کے محرم مَردوں کی نگرانی و یاددہانی کا فریضہ ادا کر سکیں اور خواتین کی دینی ذِمّہ داریاں مَرد حضرات کے علم میں بھی ہوں‘ تاکہ وہ اپنے گھر کی محرم خواتین کی ان دینی ذِمہ داریوں کی ادائیگی کے لیے سازگار ماحول فراہم کرنے کی سعی فرمائیں۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ

مختصر حالات اور فضائل ومناقب

پروفیسر محمد یونس جنجوعہ

آپ کا نام عبداللہ اور کنیت ابوبکر تھی' جبکہ صدیق اور عتیق لقب تھے۔ آپ کے والد کا نام عثمان اور کنیت ابوقحافہ تھی۔ یہ وہی ابوقحافہ رضی اللہ عنہ ہیں کہ جب فتح مکہ کے بعد اپنے بیٹے ابوبکر رضی اللہ عنہ کے ہمراہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے پاس قبولِ اسلام کے لیے حاضر ہوئے تو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ابوبکر! انہیں کیوں تکلیف دی' مَیں خود ان کے پاس پہنچ جاتا۔ ابوقحافہ رضی اللہ عنہ نے لمبی عمر پائی اور ۹۷ سال کی عمر میں ۱۴ھ میں فوت ہوئے۔ آپ کی وفات سے قبل حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رحلت فرما چکے تھے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے بچپن کے ساتھی تھے۔ دیانت وامانت اور راست بازی آپ کی امتیازی خصوصیات تھیں۔ آپ مکہ کے خوشحال تاجر تھے۔ مسلّمہ منکرات سے ہمیشہ دور رہے' اسی لیے شراب نوشی سے بھی نفرت تھی۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ اکثر میل جول رہتا' بلکہ بعض تجارتی سفروں میں بھی آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ہم رکاب رہے۔

جب آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو خلعت نبوت سے سرفراز کیا گیا اور آپؐ نے اپنے رفیق خاص ابوبکر سے اس کا تذکرہ کیا تو وہ اُسی وقت بلا تامل حلقہ بگوشِ اسلام ہو گئے۔ وجہ یہ تھی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے ساتھ میل جول نے پہلے ہی ان کو آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے اخلاقِ حسنہ کا گرویدہ بنا رکھا تھا' چنانچہ آپؓ نے قبولِ اسلام میں ذرا بھی پس وپیش نہیں کیا۔ آزاد مَردوں میں آپ سب سے پہلے شخص تھے جو ایمان لائے۔ اب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کا آپؓ کے گھر آنا جانا معمول بن گیا اور دوستی مزید پختہ ہو گئی۔

شروع میں اسلام قبول کرنے والے اکثر افراد نادار' مفلس اور غلام ہوتے تھے۔ چنانچہ

ان بے بس غلاموں کی آزادی پر ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بے دریغ مال لٹانا شروع کیا۔ بلال رضی اللہ عنہ اور عامر بن فہیرہ رضی اللہ عنہ کو ان کے ظالم مالکوں سے آپؓ ہی نے نجات دلائی۔

جب مکہ میں قریش نے اسلام قبول کرنے والوں پر عرصۂ حیات تنگ کر دیا تو انہیں اوّلاً حبشہ اور پھر مدینہ کی طرف ہجرت کرنے کا حکم ہوا۔ مسلمان ایک ایک' دو دو کر کے مدینہ روانہ ہو رہے تھے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے بھی اجازت چاہی مگر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے روک دیا۔ آخر جس دن آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کو ہجرت کے لیے اِذنِ الٰہی ہوا آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو ساتھ لیا اور رات کی تاریکی میں ہجرت کا یہ سفر اختیار کیا۔ غارِ ثور پہلی پناہ گاہ ثابت ہوئی۔ دونوں دوست غار کے اندر داخل ہو گئے۔ ابوبکر رضی اللہ عنہ نے غار کو صاف کیا اور تمام سوراخ بند کیے۔ ایک سوراخ جو رہ گیا اس پر آپؓ نے اپنی ایڑی رکھ دی۔ یہ ایک سانپ کا بل تھا اور سانپ نے آپؓ کو ڈس لیا۔ اُس وقت آنحضرت صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم آپؓ کے زانو پر سر رکھے محوِ استراحت تھے۔ درد کی شدّت سے آپؓ کی آنکھوں سے آنسو ڈھلک پڑے۔ آنسو کا ایک قطرہ حضور صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے چہرۂ انور پر گرا تو آپؐ بیدار ہوئے۔ پوچھا: کیا ہوا؟ آپؓ نے بتایا کہ سانپ نے ڈس لیا ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے اُسی وقت لعابِ دہن متاثرہ ایڑی پر لگا دیا جس سے درد رفع ہو گیا اور زہر کا فور ہو گیا۔ اس قیام نے آپ کو ''یارِ غار'' بنا دیا اور آج یہ لفظ ہر جگری دوست کے لیے استعمال ہونے لگا ہے۔

اِدھر قریش کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی ہجرت کا علم ہوا تو گرفتاری کے لیے سو اونٹوں کے انعام کا اعلان کر دیا۔ چنانچہ کئی دشمن تلاش میں نکلے' مگر سب ہی خائب وخاسر رہے۔ تین دن غار میں گزارنے کے بعد یہ کارواں آگے روانہ ہوا۔ راستے میں جو آدمی ملتا تو ابوبکرؓ سے پوچھتا: یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟ آپؓ جواب دیتے کہ یہ میرے راہ نما ہیں۔ چلتے چلتے نبوت کے چودھویں سال ربیع الاوّل کی بارہ تاریخ آپ مدینہ کے قریب پہنچ گئے۔ چند روز قبا میں قیام فرمایا اور پھر مدینہ میں داخل ہوئے۔ اُس وقت اہلِ مدینہ کا جوش وخروش دیکھنے کے قابل تھا کہ انصار پھولے نہیں سما رہے تھے۔

مدینہ پہنچ کر آپ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے بے سروسامان مہاجرین کے ایک ایک فرد کو ایک ایک انصاری کا بھائی بنا دیا۔ اسے مواخات کہتے ہیں۔ ہر انصاری نے اپنے مہاجر بھائی کے ساتھ نصرت اور ایثار کی وہ رسم ڈالی کہ تاریخ انسانیت اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ اس

رشتہ مواخات میں ابوبکرؓ کو خارجہ بن زہیرؓ کا بھائی قرار دیا گیا' جو مدینہ کے ایک معروف آدمی تھے۔ مدینہ میں اوّلین کام ایک مسجد کی تعمیر تھا جہاں اجتماعی عبادت بھی ہو اور وہ جگہ مشاورت اور تعلیم کے لیے بھی استعمال ہو۔ جو زمین اس مقصد کے لیے منتخب کی گئی اُس کی قیمت ابوبکرؓ نے ادا کی۔ بعدازاں جب مسجد کی تعمیر کا مرحلہ آیا تو جہاں دوسرے مسلمانوں نے گرم جوشی دکھائی وہاں خود رسول اللہ ﷺ اور ابوبکرؓ نے بھی مزدوروں کی طرح کام کیا۔

رمضان ۲ھ میں غزوۂ بدر پیش آیا۔ اس میں دیگر جاں نثاروں کے ساتھ ابوبکرؓ بھی شامل تھے جو تیغ بکف آنحضور ﷺ کا دفاع کرتے رہے۔ اس جنگ میں ۳۱۳ مجاہدوں نے اپنے سے تین گنا مسلح اور تیار جنگجوؤں کو شکست فاش دی۔ کُفّار کے ستّر افراد جن میں اکثر سردار تھے' میدانِ جنگ میں کھیت رہے اور تقریباً اتنے ہی مسلمانوں کی قید میں آئے۔ ان کے بارے میں مشاورت کی گئی تو فدیہ کی ادائیگی پر ان کو چھوڑنے کا فیصلہ ہوا۔ اکثر صحابہ کے ساتھ ابوبکرؓ کی بھی یہی رائے تھی۔

اگلے سال معرکہ اُحد پیش آیا۔ اس میں بھی ابوبکرؓ شامل تھے۔ پہاڑی درہ میں متعین تیراندازوں نے جب اپنی جگہ چھوڑی تو خالد بن ولید کی سرکردگی میں گھڑسوار جنگجوؤں نے اچانک ادھر سے حملہ کر دیا جس سے جنگ کا پانسہ پلٹ گیا اور فتح شکست میں تبدیل ہوگئی۔ ایک بھگدڑ مچ گئی۔ رسول اللہ ﷺ کے دندانِ مبارک زخمی ہوئے۔ یہ بھی مشہور ہو گیا کہ آپؐ شہید ہو گئے ہیں۔ ایسے موقعہ پر بھی حضرت ابوبکرؓ نے آپ ﷺ کا ساتھ نہ چھوڑا بلکہ بلند آواز سے پکارتے رہے کہ آنحضرت ﷺ زندہ ہیں۔ جنگ کے خاتمہ پر جس جماعت نے بھاگتے ہوئے کُفّار کا تعاقب کیا ان میں ابوبکرؓ بھی شامل تھے۔ معرکہ احد کے بعد پیش آنے والے تمام معرکوں میں بھی ابوبکرؓ دیگر مجاہدین کے ساتھ برابر شریک رہے۔

۶ھ میں جب مسلمان رسول اللہ ﷺ کے ساتھ عمرہ کی غرض سے مکہ روانہ ہوئے تو کُفّارِ قریش مزاحم ہوئے۔ حدیبیہ کے مقام پر پڑاؤ ڈالا گیا۔ بات چیت کے لیے حضرت عثمانؓ کو سفیر بنا کر مکہ بھیجا گیا۔ اسی اثناء میں مشہور ہوا کہ حضرت عثمانؓ کو مکہ والوں نے شہید کر دیا ہے۔ اس پر رسول اللہ ﷺ نے تمام جاں نثاروں سے جہاد پر بیعت لی۔ اس بیعت کا ذکر قرآن مجید کی سورۃ الفتح میں ہوا ہے۔ اسے بیعت رضوان کا نام دیا گیا' کیونکہ اللہ تعالیٰ نے اس

میں شامل تمام افراد کو جنہوں نے آپ ﷺ کے دستِ مبارک پر بیعت کی تھی' اپنی رضامندی کی سند عطا فرمائی۔ اس بیعت میں دیگر خوش نصیبوں کے ساتھ ابوبکر صدیقؓ بھی شامل تھے۔

۸ھ میں آنحضرت ﷺ نے قریش کی عہد شکنی کے سبب مکّہ پر حملہ آور ہونے کا ارادہ کیا۔ دس ہزار صحابہ کی جماعت آپ ﷺ کے ہمراہ تھی۔ مکہ میں فاتحانہ داخل ہونے والی قدسی صفات کی حامل اس جماعت میں ابوبکرؓ بھی شامل تھے۔ اسی موقعہ پر آپؓ کے والد ابوقحافہؓ نے اسلام قبول کیا جس کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ فتح مکہ سے واپسی پر بنو ہوازن سے جنگ ہوئی جس میں ابوبکرؓ شامل تھے۔

آپؓ کی سیرت و کردار میں انفاق فی سبیل اللہ کا بے مثال واقعہ غزوۂ تبوک کی تیاری کے موقعہ پر پیش آیا' جب رسول اللہ ﷺ کی ترغیب پر آپ اپنے گھر گئے اور گھر کا کُل اثاثہ لا کر آنحضرت ﷺ کے قدموں میں ڈال دیا۔ جب آپ ﷺ نے پوچھا کہ ابوبکر! گھر میں کیا چھوڑ آئے ہو؟ تو عرض کیا کہ گھر والوں کے لیے اللہ اور اُس کا رسول ﷺ کافی ہے۔ علّامہ اقبال نے اس کیفیت کو اپنے اس شعر میں بیان کیا ہے ؎

پروانے کو چراغ ہے بلبل کو پھول بس
صدیق کے لیے ہے خدا کا رسول بس!

اس موقع پر حضرت عمر فاروقؓ اور حضرت عثمان غنیؓ نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا مگر حضرت ابوبکرؓ کا عمل ایسا تھا کہ آپ فی سبیل اللہ انفاق کرنے والوں کے سرخیل ٹھہرے۔

۹ھ میں رسول اللہ ﷺ نے حضرت ابوبکرؓ کو امیرِ حج بنا کر مکہ روانہ فرمایا۔ اسی موقع پر سورۃ التوبہ کی آیات نازل ہوئیں جن کا اعلان حج کے موقعہ پر کرنا تھا۔ آپ ﷺ نے ان آیات کے اعلان کے لیے حضرت علیؓ کو مکہ بھیجا۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ابوبکرؓ نے پوچھا: کیا آپ کو امارتِ حج کی ذمہ داری سونپی گئی ہے؟ اس پر انہوں نے جواب دیا کہ نہیں' امیر حج تو آپ ہی ہیں' البتہ مجھے حج کے موقع پر سورۃ التوبہ کی یہ آیات سنانے کے لیے خصوصی طور پر بھیجا گیا ہے۔

۱۰ھ میں رسول اللہ ﷺ حجۃ الوداع کے لیے مکہ تشریف لے گئے۔ جاں نثار صحابہ کثیر تعداد میں آپ ﷺ کے ہمراہ تھے۔ اس موقع پر میدانِ عرفات میں آپ ﷺ نے جو خطبہ دیا وہ تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔ دیگر پند و نصائح کے علاوہ آپ ﷺ نے کہا: مَیں نہیں

کہہ سکتا کہ اگلے سال پھر یہاں لوگوں سے ملاقات ہو۔ پھر واپسی پر آپ ﷺ نے فرمایا: اللہ تعالیٰ نے ایک بندہ کو دنیا اور عقبیٰ کے درمیان اختیار دیا تھا لیکن اس نے عقبیٰ کو دنیا پر ترجیح دی''۔ یہ سن کر ابوبکر رضی اللہ عنہ رونے لگے' کیونکہ وہ آپ ﷺ کا اشارہ سمجھ رہے تھے۔ اس کے بعد آنحضرت ﷺ علیل ہو گئے۔ جسمانی کمزوری بڑھتی گئی۔ جب آپ ﷺ مسجد تشریف لانے سے بھی معذور ہو گئے تو حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ کو حکم دیا کہ وہ مسجد نبوی میں نماز کی امامت کرائیں۔ تعمیل ارشاد میں آپؓ نماز پڑھانے لگے۔ اس طرح آپؓ نے آنحضرت ﷺ کے حین حیات سترہ نمازوں کی امامت کرائی۔

۱۲ ربیع الاول ۱۱ھ بروز پیر آنحضرت ﷺ نے وفات پائی۔ اس دن آپؐ نے ابوبکر رضی اللہ عنہ کو نماز پڑھاتے دیکھا' خوش ہوئے اور مسکرائے۔ نماز کے بعد ابوبکر رضی اللہ عنہ اجازت لے کر مکہ سے باہر گئے۔ وہاں سے واپس آئے تو رسول اللہ ﷺ کا وصال ہو چکا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا غم واندوہ سے برا حال تھا۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کو تو کسی کی زبان سے آنحضرت ﷺ کے انتقال کی خبر سننا گوارا نہ تھا' اور آپؐ کی رحلت ہی کا انکار کر رہے تھے۔ اس وقت حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ نے کھڑے ہو کر خطبہ دیا جس میں سورۂ آل عمران کی آیت ۱۴۴ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: ''جو کوئی محمد ﷺ کی پرستش کرتا تھا تو (وہ جان لے کہ) بے شک محمد ﷺ فوت ہو چکے ہیں۔ اور جو کوئی اللہ کی عبادت کرتا تھا تو (وہ خاطر جمع رکھے کہ) اللہ تعالیٰ بے شک زندہ ہے' اُسے کبھی موت نہ آئے گی۔'' آپؓ کی یہ پُرتاثیر گفتگو سن کر حاضرین کو اطمینان ہو گیا اور انہوں نے اس صدمے کی برداشت کا حوصلہ پایا۔

رسول اللہ ﷺ کی وفات کے ساتھ ہی خلافت کا مسئلہ پیدا ہوا جسے منافقین نے فتنہ بنانا چاہا۔ سقیفہ بنی ساعدہ میں پہلے انصار اکٹھے ہوئے' بعد ازاں مہاجرین بھی پہنچ گئے۔ اب ان دونوں میں اختلاف ہوا۔ قریب تھا کہ معاملہ خطرناک صورت اختیار کر لے' کیونکہ انصار کا اصرار تھا کہ ایک خلیفہ انصار سے ہو اور ایک مہاجرین سے۔ اسی اثناء میں ابوبکر اور عمر رضی اللہ عنہما وہاں پہنچ گئے۔ ابوبکرؓ نے صورت حال دیکھ کر فیصلہ کن انداز میں فرمایا کہ خلیفہ تو قریش میں سے ہی ہوگا' اس لیے کہ نبی کریم ﷺ نے ارشاد فرمایا تھا: ((الائمۃُ مِنْ قُرَیش)) یہ ابوعبیدہ اور عمر ہیں' ان میں سے جس کے ہاتھ پر چاہو بیعت کر لو۔ اس پر عمر رضی اللہ عنہ اُٹھے اور کہا: اس وقت سب لوگوں

سے بہتر اور رسول اللہ ﷺ کے پیارے ابوبکر ہی ہیں' میں ان کے ہاتھ میں ہاتھ دیتا ہوں۔ اس رائے کو سب نے پسند کیا اور لوگ اُسی وقت آپؓ کے ہاتھ پر بیعت کے لیے لپکے۔ اگلے دن مسجد نبوی میں بیعت عامہ ہوئی اور حضرت ابوبکرؓ نے پہلا خطبہ خلافت دیا جو تاریخی اہمیت کا حامل ہے۔

حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کی خلافت کا دور سوا دو سال ہے' مگر اس مختصر عرصے میں آپؓ نے خلافت علیٰ منہاج النبوۃ کی بنیاد رکھ دی۔ رسول اللہ ﷺ اپنی حیاتِ دنیوی کے آخری ایام میں نوعمر اسامہ رضی اللہ عنہ کی سرکردگی میں مجاہدین کو شام کی طرف لشکر کشی کا حکم دے چکے تھے۔ اب حالات تبدیل ہوئے تو لوگوں نے آپؓ کو مشورہ دیا کہ اندرونی اور بیرونی خطرات درپیش ہیں' اس لیے اس لشکر کی روانگی مؤخر کر دینی چاہیے۔ مگر آپؓ نے جواب دیا کہ جس لشکر کو حضور ﷺ کوچ کا حکم دے چکے ہیں' ابوبکر کون ہوتا ہے کہ اس کو روک لے؟ اسی طرح کچھ لوگ نبوت کا دعویٰ لے کر اٹھے۔ آپؓ نے ان کے خلاف سخت رویہ اختیار کیا اور ان کا قلع قمع کر دیا۔

کچھ لوگوں نے زکوٰۃ کو جرمانہ قرار دیتے ہوئے اس کی ادائیگی سے انکار کیا۔ آپؓ نے ان کے خلاف بھی کارروائی کا ارادہ کیا۔ بعض صحابہؓ نے مصلحتاً مشورہ دیا کہ یہ کلمہ گو مسلمان ہیں' صرف زکوٰۃ ہی کا تو انکار کر رہے ہیں' اس لیے بحالاتِ موجودہ ان کے خلاف سخت رویہ نہیں اپنانا چاہیے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی بھی یہی رائے تھی۔ مگر ابوبکر رضی اللہ عنہ قائل نہ ہوئے اور ان کے خلاف جہاد کا اعلان کر دیا: آپؓ نے فرمایا: اَیُبَدَّلُ الدِّیْنُ وَاَنَا حَیٌّ ؟ ''کیا میرے جیتے جی دین کو بدل دیا جائے گا؟'' اس سخت رویے کا اثر یہ ہوا کہ زکوٰۃ روکنے والے خود ہی زکوٰۃ لے کر بارگاہِ خلافت میں حاضر ہو گئے۔

نبوت کا دعویٰ کرنے والوں اور مرتدین کے خلاف آپؓ نے مسلّح کارروائی کی جس کے نتیجہ میں یمامہ کی خونریز جنگ لڑی گئی۔ اس جنگ میں بہت سے وہ صحابی شہید ہو گئے جو حافظ قرآن تھے۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صورت حال کی سنگینی کا جائزہ لیتے ہوئے مشورہ دیا کہ قرآن کے عالموں کی اس طرح شہادت کے نتیجہ میں قرآن کے بہت سے اجزاء ضائع ہونے کا اندیشہ ہے' اس لیے قرآن مجید کو یکجا کر کے ترتیب کے مطابق جمع کر لینا چاہیے۔ اوّل اوّل تو ابوبکر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر عذر کیا کہ جو کام رسول اللہ ﷺ نے نہیں کیا وہ میں کیسے کر سکتا ہوں؟ مگر حضرت

عمرؓ کے اصرار پر آپ قائل ہو گئے اور حضرت زید بن ثابتؓ کو قرآن جمع کرنے کا حکم دیا۔ انہوں نے کمال حزم و احتیاط کے ساتھ قرآن کے متفرق اجزاء کو یکجا کر دیا۔ حضرت ابوبکرؓ کے عہد میں حضرت زید بن ثابت کی سرکردگی میں جمع ہونے والا یہ نسخہ بعدازاں حضرت عمرؓ کے پاس رہا، جنہوں نے اسے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کو دے دیا۔ حضرت عثمان غنیؓ نے اپنے دور میں اسی نسخہ کی نقول تیار کرائیں اور انہیں عام کیا۔

آپؓ کی خلافت کے مختصر دور میں عراق اور شام کے خلاف جنگیں لڑی گئیں، جن میں دیگر سپہ سالاروں کے علاوہ حضرت خالد بن ولیدؓ نے شاندار کارنامے انجام دیے۔ ان معرکوں میں بھاری مقدار میں مالِ غنیمت ہاتھ لگا۔ عراق اور شام کے علاوہ کئی دوسرے علاقے بھی اسلامی مملکت میں شامل ہو گئے۔

خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالے ابھی صرف سوا دو سال ہوئے تھے اور عمر ۶۳ سال تھی کہ دارِفانی سے رحلت کا وقت آ گیا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کو بلا کر جانشینی کے متعلق مشورہ کیا اور حضرت عمرؓ کے بارے میں رائے لی۔ کچھ صاحبان نے ان کی طبیعت کی سختی کا ذکر کیا تو کہا کہ خلافت کی ذمہ داری اس کو خود ہی نرم کر دے گی۔ چنانچہ حضرت عمرؓ کے حق میں عہد نامہ خلافت تحریر کرا دیا۔ جب خود مسجد نہ جا سکے تو امامت کی ذمہ داری حضرت عمرؓ کے سپرد کر دی۔ جمادی الاوّلیٰ ۱۳ھ کو آپ کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی۔ غسل آپ کی اہلیہ اسماء بنت عمیس رضی اللہ عنہا نے دیا۔ آپؓ کی وصیت کے مطابق پرانے کپڑوں ہی کو دھو کر آپؓ کے کفن میں استعمال کیا گیا۔ حضرت عمرؓ نے نماز جنازہ پڑھائی اور رسول اللہ ﷺ کے پہلو میں دفن ہوئے۔

رسول اللہ ﷺ کے آپ یارِ غار تھے۔ اکثر اکٹھے رہتے۔ ایک دوسرے کے گھر اکثر آیا جایا کرتے۔ رسول اللہ ﷺ کو آپؓ پر بہت اعتماد تھا۔ پوشیدہ سے پوشیدہ بات بھی وہ آپؓ سے کر لیا کرتے۔ سفرِ ہجرت جو انتہائی رازداری کے ساتھ ہو رہا تھا اس میں خانۂ صدیق کے افراد ہی ہم راز تھے۔ آپؓ خود رسول اللہ ﷺ کے ساتھی تھے۔ آپؓ کا بیٹا عبداللہؓ رات کے وقت آ کر حالات سے باخبر کرتا۔ آپؓ کا خادم عامر بن فہیرہؓ روزانہ دودھ مہیا کرنے کے لیے بکریاں لے کر آتا اور آپ کی بیٹی اسماء رضی اللہ عنہا کھانا تیار کر کے بھیجتیں۔

بارگاہِ نبوت میں آپؓ کا تقرب سب سے زیادہ تھا۔ جو بات کوئی شخص آپ ﷺ سے

نہیں کر سکتا تھا، وہ ابوبکر کر لیتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت علیؓ نے حضرت فاطمہؓ کی موجودگی میں عمرو بن ہشام (ابوجہل) کی بیٹی سے نکاح کرنا چاہا۔ رسول اللہ ﷺ کو اس کی خبر ہوئی تو اس بات کو پسند نہ کیا۔ اسی دوران حضرت علیؓ آنحضرت ﷺ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو آپ ﷺ کو ناراض پایا۔ اس پر وہ باہر چلے گئے اور حضرت ابوبکرؓ کو ساتھ لے کر بارگاہ نبوت میں حاضر ہوئے۔ آپ ﷺ نے ابوبکرؓ کو دیکھا تو چہرہ پر خوشی کے آثار نمایاں تھے۔ پھر حضرت علیؓ نے جگر گوشہ رسولؐ کی موجودگی میں دوسرا نکاح نہیں کیا۔

حضرت عمرؓ نے اپنی بیٹی حفصہ رضی اللہ عنہا کا پیغام دیا مگر ابوبکرؓ خاموش رہے۔ بعدازاں جب وہ رسول اللہ ﷺ کے نکاح میں آئیں تو آپؓ نے حضرت عمرؓ پر واضح کیا کہ آپ کو اُس وقت میری خاموشی ضرور ناگوار محسوس ہوئی ہوگی، مگر میں رسول اللہ ﷺ کے ارادہ سے آگاہ تھا اور اس راز کو ظاہر نہیں کرنا چاہتا تھا۔

ایک دفعہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ جس کسی نے بھی مجھ پر کوئی احسان کیا ہے، مَیں نے اس کا بدلہ اتار دیا ہے، سوائے ابوبکرؓ کے کہ ان کے احسان کا بدلہ اللہ تعالیٰ ہی چکائے گا۔ ایک دفعہ آپ ﷺ نے فرمایا کہ مسجد کے احاطہ میں کھلنے والے تمام دروازے بند کر دیے جائیں مگر ابوبکرؓ کا دروازہ کھلا رہے۔ ایک شخص کے پوچھنے پر کہ یا رسول اللہؐ! آپ کے نزدیک مَردوں میں سب سے زیادہ محبوب شخصیت کون سی ہے؟ آپ ﷺ نے فرمایا: ابوبکرؓ۔

اللہ تعالیٰ نے آپؓ کو فراست، ذہانت اور نورِ بصیرت سے نوازا تھا۔ خوابوں کی تعبیر بتانے کی صلاحیت خوب رکھتے تھے۔ لوگ آپؓ کے پاس اپنے خواب بیان کرتے اور ان کی تعبیر پوچھتے تھے۔ رسول اللہ ﷺ کی حیاتِ مستعار کے آخری دنوں میں حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا نے خواب دیکھا کہ ان کے حجرے میں تین چاند اُترے ہیں۔ انہوں نے حضرت ابوبکرؓ سے اس کی تعبیر پوچھی تو وہ خاموش رہے۔ بعدازاں جب رسول اللہ ﷺ رحلت کے بعد حجرۂ عائشہؓ میں دفن ہوئے تو آپؓ نے فرمایا: عائشہؓ یہ پہلا اور سب سے بہتر چاند ہے جو تمہارے حجرہ میں اترا ہے۔

آپؓ گفتگو میں بہت محتاط تھے۔ سمجھتے تھے کہ زبان سے نکلے ہوئے ہر لفظ پر بازپرس ہو سکتی ہے، لہٰذا بات سوچ سمجھ کر کرتے۔ یہی وجہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کے اس سفر و حضر کے

ساتھی سے بہت کم احادیث مروی ہیں۔

رزقِ حلال کے معاملہ میں حد درجہ احتیاط کرتے تھے۔ ایک دفعہ آپؓ کا غلام کھانے کی کوئی چیز لایا۔ خلافِ معمول آپؓ نے کھانے سے پہلے نہ پوچھا کہ کہاں سے لائے ہو۔ بعدازاں احساس ہوا تو پوچھنے پر غلام نے بتایا کہ ایّامِ جاہلیت میں مَیں نے کسی کی جھوٹ موٹ فال نکالی تھی' آج اس شخص نے اسی کے صلہ میں یہ چیز دی۔ یہ سن کر آپؓ نے اپنے منہ میں انگلی ڈالی اور سب کھایا ہوا قے کر دیا۔

نام ونمود' ریاکاری اور دنیا طلبی سے سخت نفرت کرتے تھے۔ امارت کو بہت بڑی ذمہ داری سمجھتے تھے۔ ایک دفعہ کسی نے کہا نصیحت فرمایئے! تو کہنے لگے: ''تم پر اللہ کی رحمت اور برکت ہو۔ نماز پڑھو' روزے رکھو' زکوٰۃ دیتے رہو اور حج کرو۔ نیز سب سے بڑھ کر یہ کہ کبھی امارت قبول نہ کرنا۔ دنیا میں امیر کی ذمہ داری بہت زیادہ ہے۔ قیامت کے روز اس کی باز پرس نہایت سخت ہوگی۔''

ساری زندگی اپنا مال اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی راہ میں لٹاتے رہے' جس میں غلاموں کی آزادی' غریبوں اور مسکینوں کی مالی امداد اور جہاد کی تیاری میں بے دریغ خرچ کرنا شامل ہے۔ خلافت کے دوران حال یہ ہوگیا کہ بیت المال کے مقروض ہوگئے۔ وفات کے وقت وصیت کی کہ سب سے پہلے میرا فلاں باغ بیچ کر بیت المال کا قرض اتارنا' پھر بیت المال کی جو بھی چیز گھر میں نظر آئے حضرت عمرؓ کے حوالہ کر دینا۔ زندگی میں مستحقین کی امداد اس طرح کثرت سے کرتے کہ کسی کو کانوں کان خبر نہ ہوتی۔

آپ تجارت پیشہ اور خوشحال سوداگر تھے۔ دور دراز کے تجارتی سفر بھی اختیار کیے اور خوب کمایا۔ قبولِ اسلام کے بعد انفاق فی سبیل اللہ بھی دل کھول کر کیا۔ خلافت کی ذمہ داری سنبھالنے کے بعد بھی کاروبار جاری رکھنا چاہا' مگر اس سے عوام کی فلاح و بہبود کے کاموں میں رکاوٹ آتی تھی۔ چنانچہ کاروبار چھوڑ دیا اور ہمہ تن عوام کی خدمت میں لگ گئے۔ گزر اوقات کے لیے معمولی سا وظیفہ بیت المال سے لینا قبول کیا۔ وظیفے کی یہ رقم اتنی کم تھی کہ گھر کے بنیادی اخراجات مشکل سے پورے ہوتے تھے۔

آپؓ انتہائی سادہ زندگی گزارتے تھے۔ تکلفات سے نفرت تھی۔ سادہ لباس اور سادہ سا

کھانا پسند کرتے۔ جوں جوں زندگی آگے بڑھتی گئی اس سادگی میں اور اضافہ ہوتا گیا' یہاں تک کہ نئے کپڑے کا کفن بھی گوارا نہ کیا' بلکہ وصیت کی کہ مجھے پرانے کپڑوں ہی میں کفن دے دینا' نیا کپڑا کسی زندہ کے کام آجائے گا۔

آپؓ نہایت منکسر المزاج انسان تھے۔ خاکسارانہ رویّہ اور تواضع پسند تھی۔ اپنے کام خود کر لیتے۔ جوانی میں بھیڑ بکریاں بھی چرائیں۔ آس پاس رہنے والوں کی ضروریات کا خیال رکھتے۔ جب آپ خلیفہ ہوئے تو محلے کی ایک لڑکی کو تشویش ہوئی کہ پہلے تو ابوبکرؓ اس کی بکریوں کا دودھ دوہ دیا کرتے تھے' اب کیا ہوگا۔ آپؓ کو خبر ہوئی تو اسے تسلی دی کہ تمہارا کام اب بھی مَیں کر دیا کروں گا۔ اگر کوئی تعریف کرتا تو پسند نہ کرتے اور دعا کرتے ''اے اللہ! تو مجھے اس کے حسن ظن سے بہتر کر دے' میرے گناہوں کو بخش دے اور لوگوں کی بے جا تعریف کا مجھ سے مواخذہ نہ کرنا۔''

آپؓ رسول اللہ ﷺ کی سنتوں کے عاشق تھے۔ کوئی کام آپؐ کے طریقے سے ہٹ کر کرنا انہیں گوارا نہ تھا۔ رسول اللہ ﷺ کے طریقے پر رات کو دیر تک نوافل میں مصروف رہنا آپ کا معمول تھا۔ خوفِ خدا اس حد تک تھا کہ اپنی مغفرت کی دعا کرتے کرتے داڑھی آنسوؤں سے تر ہو جاتی۔

آپؓ کی چار بیویاں تھیں' جن سے تین بیٹے عبداللہ' عبدالرحمٰن اور محمد' جبکہ تین بیٹیاں اَسماء' عائشہ اور اُمّ کلثوم تھیں ——— رضی اللہ تعالیٰ عنہم وارضاھم اجمعین!!

❁❁❁

بانی تنظیم اسلامی ڈاکٹر اسرار احمدؒ
کے دو فکر انگیز خطابات پر مشتمل کتابچہ
توبہ کی عظمت اور تاثیر
اور موجودہ حالات میں کرنے کا اصل کام
اشاعتِ خاص: 65 روپے
اشاعتِ عام: 35 روپے

داعیٔ قرآن ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ کی چند فکر انگیز تالیفات

قرآن حکیم کی عظمت و تعارف اور حقوق و مطالبات
جیسے علمی و عملی موضوعات پر 8 کتابوں کا مجموعہ

قرآنِ حکیم اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

عظمت مصطفےٰ ﷺ، مقصد بعثت، اسوۂ رسول ﷺ اور
سیرت نبوی ﷺ کے انقلابی پہلوؤں پر مشتمل مقالات کا مجموعہ

رسولِ اکرم ﷺ اور ہم

اشاعت خاص 600 روپے، اشاعت عام 350 روپے

اسلام میں ستر و حجاب کے احکام
اور اسلامی معاشرے میں خواتین کے کردار
پر ایک مختصر مگر جامع تالیف

اسلام میں عورت کا مقام

اشاعت خاص 120 روپے، اشاعت عام 80 روپے

سیرت مطہرہ کے دل پذیر موضوع پر ڈاکٹر صاحب
کی زندگی کے آخری خطابات کا مجموعہ

سیرتِ خیر الانام علیہ الصلوٰۃ والسلام

صفحات 240، قیمت 180 روپے

اخلاص فی العبادت اور اقامتِ دین
کی اہمیت و فرضیت، بعنوان:

توحیدِ عملی

سورۃ الزمر تا سورۃ الشوریٰ کی روشنی میں

اشاعت خاص 225 روپے، اشاعت عام 150 روپے

شرک کی حقیقت، اقسام اور دورِ حاضر
کے شرک سے واقفیت کے لیے مطالعہ کیجیے

حقیقت و اقسامِ شرک

اشاعت خاص 125 روپے، اشاعت عام 70 روپے

امت مسلمہ سے خطاب کے ضمن میں قرآن کی جامع ترین سورت

سورۃ الحدید

(اُمّ المُسبّحات) کی مختصر تشریح

اشاعت خاص 300 روپے، اشاعت عام 150 روپے

خلافت کی حقیقت، تاریخی پس منظر، عہد حاضر میں
اس کا ڈھانچہ اور اس کے قیام کے نبوی طریق پر مشتمل

خلافت کی حقیقت

اور عصر حاضر میں اس کا نظام

اشاعت خاص 200 روپے، اشاعت عام 180 روپے

مکتبہ خدام القرآن
K-36 ماڈل ٹاؤن لاہور
فون 3-35869501(042)
ای میل maktaba@tanzeem.org ویب سائٹ www.tanzeem.org

فلسفۂ انقلاب کے نقطۂ نظر سے
سیرت النبی ﷺ کا اجمالی مطالعہ

منہجِ انقلابِ نبویؐ

غارِ حرا کی تنہائیوں سے لے کر
مدینۃ النبیؐ میں اسلامی ریاست کی تشکیل
اور اس کی بین الاقوامی توسیع تک'
اسلامی انقلاب کے مراحل' مدارج اور لوازم پر مشتمل

بانیٔ تنظیم اسلامی
محترم ڈاکٹر اسرار احمد رحمۃ اللہ علیہ
کے دس خطباتِ جمعہ کا مجموعہ

(جدید نظرثانی شدہ ایڈیشن)

۞ صفحات: 360 ۞ قیمت اشاعت خاص: 500 روپے اشاعت عام: 300 روپے

"منہجِ انقلابِ نبویؐ" کے مباحث کی تلخیص پر مشتمل کتابچہ

رسولِ انقلاب ﷺ کا طریقِ انقلاب

۞ صفحات: 64 ۞ قیمت اشاعت خاص: 50 روپے ۞ اشاعت عام: 30 روپے

مکتبہ خدام القرآن لاہور
36۔ کے' ماڈل ٹاؤن لاہور' فون: 3-35869501

Dec 2020
Vol.69

Monthly Meesaq Lahore

Regd. CPL No.115
No.12

Kausar
BANASPATI & COOKING OILS
کچھ خاص ہمارے کھانے میں

KausarCookingOils

Pakistan Standards